مجلّہ طلوع اسلام کا اجراء 1938ء میں علامہ اقبالؒ کے ایما اور قائداعظمؒ کی خواہش پر عمل میں آیا۔

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوع اسلام

ماھنامہ ______ لاھور

خط و کتابت: ناظم ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ) 25 بی گلبرگ۔ 2 لاہور 54660 ٹیلی فون: 876219 فیکس: 92-42-876219

فہرست مشمولات

لمعات	ادارہ طلوع اسلام	2
اسلام اور مذہبی رواداری	علامہ غلام احمد پرویزؒ	5
مخلوط انتخابات اور پاکستان	محمد عمر دراز (لاہور)	18
دو قومی نظریہ اور ہندو ثقافت کی یلغار	علی محمد چدھڑ (گوجرانوالہ)	27
حقائق و عبر	ادارہ طلوع اسلام	33
مجلس اقبالؒ (تبصرہ)	محمد عمر دراز (لاہور)	34
افلا تتفکرون	شائستہ اشرف (بھلوال)	41
پاکستان اور فرقہ واریت	جناب کرامت اللہ خان غوری	44
نئے پڑھنے والوں کے لئے	ادارہ طلوع اسلام	55
ضعف نازک پر مجازی خداؤں کی چیرہ دستیاں	رحمت اللہ طارق (ملتان)	56
JINNAH PAPERS	ادارہ طلوع اسلام	64

انتظامیہ:- چیئرمین: ایاز حسین انصاری -- ناظم: محمد لطیف چوہدری

مدیر مسئول: محمد لطیف چوہدری -- مجلس ادارت: میجر محمد یوسف ڈار۔ محمد عمر دراز۔ ڈاکٹر صلاح الدین اکبر --

ناشر: عطاء الرحمٰن ارائیں

طابع: خالد منصور نسیم -- مطبع: النور پرنٹرز و پبلشرز 3/2 فیصل نگر ملتان روڈ لاہور۔

مقام اشاعت: 25-B گلبرگ 2 لاہور۔ 54660

جلد 49 | شمارہ 6 | جون 1996ء

بدل اشتراک

فی پرچہ =/10 روپے | اندرون ملک سالانہ 120 روپے | ایشیا، افریقہ، یورپ 550 روپے | آسٹریلیا، امریکہ، کینیڈا 750 روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

گلا تو گھونٹ دیا اہل سیاست نے تیرا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

(1) پاکستان کا مطلب کیا؟

کوئی سا اخبار اٹھا لیجئے۔ قتل، ڈکیتی، دہشت گردی اور جنسی تشدد کی وارداتوں سے بھرا ہوا ملے گا۔ عوام جبر و استبداد کا شکار ہیں اور سیاستدان نشہ اقتدار میں چور۔ نظم و نسق تہ و بالا اور معیشت تباہ ہو کر رہ گئی ہے۔ سیاستدانوں کا ایک گروہ کسی ایک آقا کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہے تو دوسرا گروہ کسی دوسرے آقا کی تلاش میں سرگرداں۔ ایسے میں علماء حضرات سے توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ کج رو سیاستدانوں کو اللہ اور رسولؐ کی راہ دکھائیں لیکن وائے بد نصیبی کہ ان کے اپنے منہ کو سیاست کا لہو لگ چکا ہے۔ وہ سیاسی پارٹیوں کے گٹھ جوڑ میں مصروف ہیں تو یہ مذہبی فرقہ بندی کو ہوا دینے میں مشغول۔ طرفہ تماشہ یہ کہ دعویٰ اس کے باوجود مسلمان ہونے کا بھی ہے اور مطالبہ نفاذ اسلام کا بھی۔ اب، یا تو ہمارے سیاستدان، علما کرام اور اکابرین ملت، اسلام کا کوئی ایسا ایڈیشن تیار کر چکے ہیں جس میں یہ سب کچھ جائز، مستحب یا مباح ہے یا جان بوجھ کر عوام کو بے وقوف بنایا جا رہا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قیام پاکستان سے پہلے، علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ نے پاکستان کا جو تصور مسلمانوں کو دیا وہ اس سے زیادہ کچھ نہ تھا کہ پاکستان کی بنیاد لا الٰہ الا اللہ پر ہو گی جس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان میں حق حکومت نہ کسی پارلیمان کو حاصل ہو گا نہ طاقت کا سرچشمہ عوام ہونگے۔ پاکستان میں ہر عمل اللہ کے احکام کے مطابق ہو گا، اور یہ احکام قرآن مجید میں پہلے سے موجود ہیں۔ عوام کو اس وقت اس سے زیادہ کچھ سمجھنے کی نہ ضرورت تھی نہ رہنمایان تحریک پاکستان کو اس کی فرصت تھی کہ اس کی تفاصیل وہ قوم کے سامنے پیش کر سکیں، لیکن یہ کہنا ہرگز درست نہ ہو گا کہ اسلام کے متعلق عوام کا مبلغ علم نماز، روزے تک محدود تھا اور وہ اسلام کے سوشل آرڈر سے آگاہ نہ تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کا مطمع نظر اگر نماز، روزے تک محدود ہوتا تو اس کی ضمانت تو ہندو کانگرس انہیں دے چکی تھی پھر ملک گیر سطح پر لا الٰہ الا اللہ کا نعرہ کیوں؟ لہٰذا اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش سرے سے موجود ہی

نہیں۔ لا الٰہ سے عوام کا مطلب لا الٰہ ہی تھا۔ مگر پاکستان بن جانے کے بعد جب اس نعرے کو عملی جامہ پہنانے کا وقت آیا تو اللہ کی حکمرانی کا تصور نہ سیاستدانوں کو راس آیا نہ سرمایہ داروں اور جاگیر داروں کو اس میں عافیت دکھائی دی۔ عوام یہاں آتے ہی آباد کاری کے گورکھ دھندوں میں الجھ گئے اور خواص ایک ایک کر کے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مذہبی علما کی اکثریت پہلے ہی ایسے اسلام کی متلاشی تھی جس میں پبلک اور پرائیویٹ لاز کی ثنویت برقرار رہے۔ لہٰذا قیصر اور کلیسا کی ملی بھگت سے پاکستان میں ایک ایسا دستور وجود میں آگیا۔ جس کی رو سے ملک کے جملہ حقوق پارلیمان کی تحویل میں آگئے اور کلیسا کو اس کا حصہ یوں مل گیا کہ "قرآن و سنت" کی بطور تبرک اگر کبھی ضرورت پیش آئی تو اس سے مراد وہی کچھ لیا جائیگا جو وہ کہیں گے۔ وہ بھی خوش۔ یہ بھی راضی۔ عوام کے ساتھ' ان حالات میں جو کچھ ہونا تھا وہ ہو رہا ہے۔ حکم اذاں ان کے لئے اب اتنا ہی ہے کہ جو کچھ ان کے ساتھ ہو رہا ہے اسے نوشتہ تقدیر سمجھ کر قبول کر لیں اور نماز پڑھکر سیاستدانوں کی صحت اور سلامتی کے لئے دعا کیا کریں۔ مگر نہیں۔ بات اس سے بہت آگے بڑھ چکی ہے اور ہماری مذہبی پیشوائیت اور سیاستدانوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ پاکستان کا مطلب' پاکستان بننے سے پہلے بھی لا الٰہ الا اللہ تھا اور آج بھی لا الٰہ الا اللہ ہے۔ کلام اللہ کے اس چھوٹے سے ٹکڑے کا مطلب جاننے کے لئے نہ عربی جاننا ضروری ہے نہ لغت ہائے حجازی درکار ہیں۔

ہمارے دانشوروں اور لیڈروں کے دل میں کیا تھا۔ یہ ایک الگ موضوع ہے جس پر ہم متعدد بار لکھ چکے ہیں۔ جہاں تک گلی کوچوں میں بسنے والے عوام کا تعلق ہے وہ ایک ہی بات جانتے تھے کہ پاکستان میں اللہ کے بندوں پر اللہ کی حکمرانی ہو گی اور یہی ان کا نعرہ تھا۔ پاکستان بن جانے کے بعد اس کی عملی صورت کیا ہو گی؟ ان کے ذہنوں میں اس کے متعلق بھی کوئی ابہام نہ تھا کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ان کے سامنے تھی۔ ہماری بدقسمتی یہ کہ اول تو تحریک پاکستان کی کوئی مستند تاریخ لکھی ہی نہیں گئی اور اگر کچھ لکھا گیا ہے تو وہ مفاد پرستوں کی توضیحات پر مبنی ہے۔ کسی لکھنے والے نے عوام کے دلوں میں جھانک کر دیکھا ہی نہیں کہ وہ کیا کہتے تھے۔ کیا چاہتے تھے اور انہیں کیا ملا۔ پاکستان میں بسنے والے کسی ان پڑھ سے ان پڑھ آدمی کو آج بھی یہ مژدہ سنایئے کہ ایسا دور آرہا ہے جس میں اللہ کے بندوں پر صرف اللہ کی حکمرانی ہو گی تو آپ دیکھیں گے کہ جہاں سیاسی اور مذہبی حکمرانوں کی ماں مر جائیگی وہاں اس سے ان پڑھ مسلمان کی خوشی سے باچھیں کھل اٹھیں گی۔ یہ تھا پاکستان کا مطلب جو پاکستان بنانے والوں نے سمجھا۔ یہ تھا وہ نعرۂ حق جس کے سامنے نہ انگریز ٹھہر سکا نہ ہندوؤں کی سازشوں کا سیل بے پناہ اس راہ میں حائل ہو سکا۔

پاکستان کا مسئلہ ہماری نظر میں قطعاً گھمبیر نہیں۔ ہمارے سیاستدان اگر قرآن کی مستقل اقدار کے

مطابق عمل کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے دکھوں کا مداوا نہ ہو۔ وطن عزیز کو مسلمان بنانا ہے تو دستور پاکستان میں بلاشرکت غیرے اللہ کی حکمرانی اور قرآن کی بالا دستی کی شق رکھ دیجئے اور پھر اپنے دستور کی ہر شق کو اس کی متعین کردہ حدود کے اندر لاتے جایئے اور پھر دیکھئے کہ کس طرح ہمیں ان تمام الٰہوں (خداؤں) سے نجات مل جاتی ہے جن کی چوکھٹ پر سر جھکانے کے لئے ہمارے سیاستدانوں کو دور دراز کے سفر اختیار کرنے پڑتے ہیں اور ہمارے مذہبی علما کو اپنا تقدس برقرار رکھنے کے لئے مذہبی فرقوں کی تنگناؤں میں پناہ لینی پڑتی ہے۔

ضرورت لا الٰہ الا اللہ کا نعرہ پھر سے بلند کرنے کی ہے۔ ایسا کر دیکھئے' تہذیب آذری کے سارے بت خود بخود زمیں بوس ہو جائیں گے اور زمین اپنے پیدا کرنے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔ طلوع اسلام نے یہ نعرہ اپریل 1938ء میں بلند کیا تھا اور اسے آئینی طور پر نافذ کروانے کے لئے آج بھی اسی طرح مصروف تگ و تاز ہے۔ ہماری نظر میں اس سے بہتر کوئی حل نہیں کہ قوم اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لے اور لا الٰہ الا اللہ کی پالیسی پر گامزن ہو جائے۔ یہی ایک نعرہ پاکستان کے قیام کا باعث بنا تھا یہی اس کے استحکام کا ذریعہ ثابت ہو گا اور اسی میں ہم سب کی بھلائی ہے۔

(2) عمران خان اور تحریک انصاف

مسٹر عمران خان نے کرکٹ کے کھیل میں بڑا نام پیدا کیا ہے۔ اسی وجہ سے وہ دنیا کے اکثر ممالک میں متعارف ہیں۔ پھر انہوں نے کینسر ہسپتال بنا کر ایک ایسا کارنامہ سرانجام دیا جو کم از کم پاکستان کی تاریخ میں بے مثل ہے اور جس کی وجہ سے ان کا نام تادیر زندہ رہے گا۔ تقسیم ملک کے بعد صرف لاہور شہر میں ہندو لوگ اربوں روپے کی جائیداد چھوڑ گئے تھے لیکن کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کون لوگ تھے۔ تاہم دیال سنگھ' گنگا رام' گلاب دیوی کے نام اب بھی زبان زد خلائق ہیں اور یہ نام اس وقت تک زندہ رہیں گے جب تک ان لوگوں کے تعمیر کردہ ہسپتال' کالج اور لائبریری قائم ہیں۔ اس لیے کہ یہ عین قانون خداوندی کے مطابق ہے۔ **واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض** (13:17)

"ہر وہ چیز جو لوگوں کی بھلائی کے لیے ہو گی زمین پر باقی رہے گی"۔

اب آیئے اس سوال کی طرف کہ عمران خان کی تحریک انصاف کامیاب ہو گی یا نہیں؟ اگر عمران خان قرآنک سوشل آرڈر سے واقفیت رکھتے ہیں یا اگر واقفیت نہیں رکھتے مگر واقفیت حاصل کرنے کے بعد قرآنی راہنمائی میں اپنی جدوجہد جاری رکھنے کے خواہشمند ہیں تو اللہ تعالیٰ کی مدد یقیناً ان کے شامل حال رہیگی۔ لیکن اگر وہ عملاً اللہ تعالیٰ کو الٰہ تسلیم کئے بغیر ملکی مسائل کو حل کرنے کے خواہاں ہیں تو لازماً" انہیں بھی اندھوں کی قطار میں کھڑا ہونا پڑیگا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علامہ غلام احمد پرویزؒ

اسلام اور مذہبی رواداری

(اس سلسلے کا پہلا مضمون بعنوان "خدا کی پادشاہت" مئی 96ء میں شائع ہو چکا ہے)

غالباً آپ نے سنا ہو گا کہ ایک مکتب میں جب بچوں کو شرارت سوجھتی اور وہ مولوی صاحب کے پنجہ استبداد سے کم از کم کچھ وقت کے لئے چھوٹنا چاہتے تو وہ منظم سازش کرتے' ایک آتے ہی کہتا اوہو ! قبلہ خیریت ہے- آج نصیب اعدا کچھ طبیعت مضمحل سی نظر آتی ہے- مولوی صاحب فرماتے کہ ہاں بھائی رات کچھ دیر سے سویا اچھی طرح نیند نہیں آئی- رفت گذشت- دوسرا آتا اور السلام علیکم کے بعد مولوی صاحب کے چہرہ پر متردد انہ نگاہ ڈال کر پوچھتا کہ مولانا خیریت ہے ! آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں' چہرے پر کچھ تمازت کے آثار بھی ہیں- مولوی صاحب فرماتے کہ ہاں بھئی کچھ اعضاء شکنی سی محسوس ہو رہی ہے- تیسرا ابھی آکر بیٹھنے بھی نہ پاتا کہ ایک گہری تشویش سے پوچھتا کہ مولوی صاحب' مزاج گرامی میں کچھ خرابی سی نظر آرہی ہے اب مولوی صاحب کا دل بھی ڈوبنا شروع ہو جاتا' فرماتے کہ ہاں کچھ حرارت سی محسوس ہو رہی ہے- چوتھا طالب علم ابھی آنے بھی نہ پاتا کہ مولوی صاحب لحاف اوڑھے حجرے میں دراز ہیں اور نبض پر ہاتھ رکھو تو سچ مچ تپ چڑھ رہی ہے-

مولوی صاحب کے بخار آجانے کا واقعہ افسانہ ہو یا حقیقت' لیکن اس میں کچھ کلام نہیں کہ پروپیگنڈا اگر منظم طریقہ سے کیا جائے تو فی الواقع قلب ماہیت پیدا کر دیتا ہے- اشیاء کی نوعیت اور دیکھنے والوں کی نگاہوں کے زاویئے بدل دیتا ہے- جو چاہتا ہے منوا لیتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے تسلیم کرا لیتا ہے- یہی وہ سحر سامری ہے جس کی نگاہ بندی سے قوموں کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ **لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا**- آنکھیں اپنی ہیں لیکن دیکھتے کسی اور کی عینک سے ہیں- کان اپنے ہیں' لیکن سنتے کسی اور کے آلۂ صوت سے ہیں- دل اپنے ہیں' لیکن سمجھتے کسی اور کے دماغ سے ہیں **أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ**- 7/179 "ہز ماسٹرز وائس" ہوتے ہیں-

اسلام کے ساتھ بھی دنیا میں ایسا ہی ہوا ہے- اس نے ابھی اپنی تربیت گاہ سے قدم باہر نکالا ہی تھا کہ یورپ کے ارباب حل و عقد کو اس سے خواہ مخواہ ایک خطرہ محسوس ہوا اور انہوں نے اس کا بہترین علاج یہی سوچا کہ اسلام کو اس کے اصلی خدوخال میں کہیں ظاہر ہی نہ ہونے دیا جائے- ارباب سیاست کے پیش نظر کچھ اپنی مصلحتیں تھیں' خداوندان مذہب اپنی سیادت کا تحفظ چاہتے تھے- چنانچہ دونوں گروہ اس مشترکہ مقصد کو لے کر اٹھے

اور زبان و قلم کے زور سے اسلام کی ایک ایسی بھیانک تصویر کھینچی کہ غیر تو غیر خود اپنے بھی جب اس کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھیں تو کانپ کر رہ جائیں۔ جب دول یورپ کا تسلط دیگر ممالک پر ہوا تو انہوں نے وہاں بھی اس مقصد کو فراموش نہیں ہونے دیا اور چونکہ قاعدہ ہے کہ حاکم قوم کی ہر ادا میں اک شانِ خداوندی نظر آیا کرتی ہے۔ لہٰذا اقوامِ یورپ نے اسلام کی تصویر کے جو جو ایڈیشن شائع کئے۔ دل و دماغ کے چوکھٹوں میں فریم کرا کے رکھے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج دنیائے تہذیب و تمدن میں جہاں کہیں اسلام کا نام آتا ہے غارت گری، بربادی و تباہی، ہلاکت و خوں ریزی، جور و ظلم اور ستم و استبداد کے خونی مناظر ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ جن میں نظر آتا ہے کہ (معاذ اللہ) وحشی و خوں خوار جنگلی انسانوں کے غول کے غول نیزوں اور تلواروں کی جھنکار میں سیلِ حوادث کی طرح کف بردہاں بڑھتے چلے آرہے ہیں۔ جن کے جلو میں بہیمیت و بربریت کے مجسمے ہولناک آہن پوش جنات کی شکل میں آگ اور خون کی ہولی کھیلتے، اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں میں امنڈتے چلے آتے ہیں اور اس قہر خداوندی، اس سیلاب بلا، اس طوفان بدتمیزی کے سامنے تہذیب و تمدن، علم و عمرانیت، عدل و انصاف، عفت و عصمت، مذہب و مسلک ایک ایک کر کے جڑ سے اکھڑتے چلے جاتے ہیں۔ مظلوموں کی فریاد، یتیموں کی آہ و بکا، بیواؤں کا نالہ و فغاں آسمان تک جاتا اور ٹکرا کر واپس آجاتا ہے، کہ گویا (نعوذ باللہ) اس خوں خوار قوم کے خدا کا دروازہ ان سب کے لئے بند ہے۔ جہاں جہاں سے یہ قیامت صغریٰ گذرتی ہے آبادیاں ویرانہ بن جاتی ہیں، بستیاں اجڑ جاتی ہیں، کتب خانے جل کر راکھ کا ڈھیر رہ جاتے ہیں۔ تہذیب و تمدن کے آئینہ دار قصر شاہی کھنڈرات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ کہیں ٹوٹی ہوئی صلیبوں کے انبار نظر آتے ہیں، کسی جگہ زنار کا ڈھیر دکھائی دیتا ہے۔ مندر ویران ہیں، گرجے مسمار ہیں، نہ برہمن کو کہیں امن ہے نہ کلیسا کے راہب کے لئے امان۔ نہ عورتیں محفوظ ہیں، نہ بچے مصئون۔ کچھ قتل کر دیئے گئے، جو باقی بچ گئے وہ ناک میں نکیل ڈلوائے حبشی سرداروں کے کوڑے کھاتے نخاس کی طرف گھسٹتے چلے جا رہے ہیں کہ وہاں انسانیت عظمیٰ دو دو ٹکوں میں فروخت کی جائے۔

غرضیکہ یہ ہے وہ تصویر جو اسلام کے نام کے ساتھ ہی سامنے آکر آنکھ کی پتلیوں میں سکتہ پیدا کر دیتی ہے۔ دیکھنے والے کا خون کھولنے لگتا ہے۔ حقارت و تنفر اور انتقام و مواخذہ کے بخارات قلب سے اٹھ کر دماغ پر چھا جاتے ہیں اور اسے اس "عالم سوز تہذیب اور ننگ انسانیت تمدن" کو امن و سلامتی کی دنیا سے مٹا دینے کی مختلف تدابیر و خیالات کی جولا نگاہ بنا دیتے ہیں۔ آیئے آج کی مختصر سی صحبت میں دیکھیں کہ جس تصویر کا یہ ایڈیشن آپ کے سامنے ہے اس کے صحیح خطوط کیا ہیں اور جس تہذیب و تمدن کو تلوار اور آگ کی نسبت سے انسانیت سوز سمجھا جا رہا ہے اس کی اصلیت کیا ہے۔ اسلام کی صورت مسخ کرنے والوں کی یہ بے باک جرأتیں فی الحقیقت قابل داد ہیں کہ یہ سب کچھ ایک ایسے مذہب کے متعلق پیش کیا جاتا ہے جس کا اصل دستور اساسی ایک ایک حرف اور نقطہ کی صحت کے ساتھ آج دنیا کے ہر کتب فروش کی دوکان سے مل

سکتا ہے اور جس کے صحیح علم برداروں کا ایک ایک نقش قدم مستند تواریخ کے اوراق پر جلی اور نمایاں نظر آتا ہے۔ اس مضمون میں ہم بتانا صرف یہ چاہتے ہیں کہ خدا کی اس بادشاہت میں جس کا ذکر گذشتہ مضمون میں کیا جا چکا ہے۔ غیر مسلموں کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ کیا جائے گا۔ اس کے متعلق اجمالی سی باتیں تو اس مضمون میں پیش کی گئی تھیں (اور اس اجمال کی تفصیل میں اس عنوان پر قرآن کریم کی نصوص صریحہ سے ایک مبسوط مضمون جداگانہ لکھا جا سکتا ہے)۔ لیکن ہم اس وقت تعلیمی اسناد کے بجائے تاریخی اشہاد سے واضح کرنا چاہتے ہیں کہ حکومت الٰہی میں پوری طاقت اور قوت کے ہوتے ہوئے محکوم و مفتوح غیر مسلموں کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھا جاتا تھا اور انہیں بالخصوص مذہبی آزادی کس درجہ حاصل تھی۔ اس مضمون میں ہم تاریخی شہادات بالعموم غیر مسلم مصنفوں اور مورخوں کے حوالوں سے پیش کریں گے تاکہ کسی قسم کے تعصب' جانب داری اور رجحان قلبی کا شائبہ نہ رہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ وہ سلطنت جسے ہم "خدا کی بادشاہت" کے مقدس نام سے منسوب کرتے ہیں' قرن اولیٰ کے ایک مختصرؑ سے عرصہ پر مشتمل تھی۔ اس کے بعد جو حکومت قائم ہوئی اسے آپ مسلمانوں کی سلطنت تو کہہ سکتے ہیں' لیکن صحیح معنوں میں خدا کی حکومت نہیں کہہ سکتے۔ بایں ہمہ اس حکومت میں بھی چونکہ مسلمانوں کے سامنے قرآنی تعلیم اور اسلامی روایات کے نقوش موجود تھے' اس لئے غیر مسلموں سے رواداری کے باب میں اس زمانہ میں بھی ہمیں ایسی ایسی مثالیں ملتی ہیں جو دوسرے مذاہب کی سلطنتوں میں معدوم ہیں۔

اگرچہ غیر اقوام کے ساتھ ربط و ضبط تو عہد رسالت مابؐ سے ہی شروع تھا اور فتح خیبر یہود مدینہ اور فتح مکہ جیسے مقامات پر جس قسم کی رواداری کی مثالیں ملتی ہیں تاریخ ان کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ لیکن بہ حیثیت حکومت عہد فاروقی سے اس کا سلسلہ بڑھا ہے' اور چونکہ اس عہد کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پھیلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لئے ہم شروع میں اسی عہد کے چند ایک واقعات پر نظر ڈالتے ہیں۔ اسلامی عہد حکومت میں غیر مسلم رعایا کو ذمی کہا جاتا تھا۔ جب یروشلم فتح ہوا تو وہاں کے ذمیوں کے ساتھ ایک عہد نامہ ہوا' اس کے اقتباسات سے اندازہ فرمایئے کہ بحیثیت فاتح' مغلوب و مفتوح قوم کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھا گیا۔

"یروشلم کی غیر مسلم رعایا کو ان کی جان و مال' اولاد اور عبادت گاہوں صلیبوں اور ہر اس چیز کی جو ان کی ملکیت میں ہے حفاظت کی ضمانت دی جاتی ہے۔ ان کی زمینوں اور ان کے مذہب میں کسی قسم کا تعرض نہ کیا جائے گا۔ ان کے کلیساؤں کو نہ تو منہدم کیا جائے گا اور نہ کسی قسم کا اور نقصان پہنچایا جائے گا۔ ان کے اوقاف اور ان کے وقار کو بحال رکھا جائے گا۔ اہل یروشلم کو اپنے مذہب کی پابندی میں ہر قسم کی آزادی ہو گی اور ان پر کسی قسم کا ظلم و ستم روا نہ رکھا جائے گا۔"

فتح یروشلم کے بعد حضرت عمرؓ جب گرجے کا ملاحظہ فرما رہے تھے تو وہیں نماز کا وقت آگیا۔ بطریق نے کہا کہ آپ وہیں نماز ادا کر لیں لیکن آپ نے اس بنیاد پر انکار کر دیا کہ مبادا بعد میں آنے والے

مسلمان سنت عمرؓ کی تقلید میں اس گرجا کو مسجد میں تبدیل کر لیں۔ تالیف قلوب' بالغ نظری اور مذہبی رواداری کا یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس سے سر ولیم میور جیسا متعصب بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا اور اس نے اپنی کتاب

(The Caliphate___ Its Rise and Fall.)

میں اس کا ذکر کیا ہے حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ جملہ اقوام عالم میں مذہبی تعصب جنون کی حالت تک پہنچ چکا تھا۔ اسی یروشلم میں مسلمانوں کی فتح سے پیشتر ہرقل نے ایک قیامت برپا کر رکھی تھی۔ فلسطین' شام' ایشیائے کوچک اور مصر سے تمام یہودیوں کے اخراج کا حکم عام تھا اور ان پر جس قدر مظالم توڑے جاتے ان کی کبھی داد رسی نہ ہو سکتی تھی۔ غیر مذاہب والوں سے ہی نہیں بلکہ خود عیسائی جو اس خاص فرقہ سے متعلق نہ تھے جس کا ہرقل پیرو تھا' ہر قسم کے مظالم کا شکار ہوتے تھے۔ چنانچہ یعقوبی فرقہ کا ایک بطریق لکھتا ہے کہ :-

"ہرقل نے اپنی مملکت میں اعلان کر رکھا تھا کہ جو عیسائی اس کے مشرب و مسلک سے متفق نہ ہو اس کا ناک اور کان کاٹ دیئے جائیں اور اس کا گھر بار لوٹ لیا جائے۔ یعقوبی فرقہ کے عیسائیوں کو ہرقل اپنے سامنے نہیں آنے دیتا تھا' لہٰذا ان کی کہیں شنوائی نہ ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ خدائے جبار نے بنی اسماعیل کے گھرانے سے ایک ایسی ہستی کو مبعوث کر دیا جس نے ہمیں ظالم رومیوں کے پنجہ استبداد سے نجات دلائی۔ چونکہ ان علاقوں کو فتح کرنے کے بعد مسلمانوں نے کسی عیسائی سے اس کے مذہب کے معاملہ میں تعرض نہ کیا' جو معبد کسی کے قبضہ میں تھا وہ اسی کے پاس رہنے دیا' اس لئے یہ تو نہ ہو سکا کہ ہمارے چند ایک گرجے جن پر Chalcedonian قبضہ کر چکے تھے واپس مل جاتے' لیکن ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رومیوں کے مظالم سے چھوٹ گئے اور ہمیں عربوں کے ساتھ امن کی زندگی میسر آئی"۔

یہی حالت مصر میں تھی۔ ایک آرمینین عیسائی۔ ابو صالح۔ جو تیرھویں صدی کی شروع میں ہوا ہے لکھتا ہے :-

"یہ ایسا وقت تھا کہ شہنشاہ (قیصر) قدیم مذہب کے پرستار عیسائیوں پر بیحد ظلم و ستم کرتا تھا اور انہیں زبردستی اپنے فرقہ میں داخل کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ہرقل اور مقوقس کے ہاتھوں حقیقت پسند عیسائیوں نے بیحد تکالیف اٹھائیں۔ جب مظالم انتہا کو پہنچ گئے تو ملت حنفیہ کی ایک قوم اٹھی جس نے رومیوں کے نخوت و تکبر کو توڑا اور مصر کو فتح کر کے یعقوبی فرقہ کے عیسائیوں کو رومیوں کے مظالم سے نجات دلائی"۔

چنانچہ فتح مصر کے وقت حضرت عمرو بن عاصؓ نے تمام اہل مصر کو ایک شرائط نامہ لکھ کر دیا جس کی رو سے ان کے املاک' نفوس اور اولاد سب محفوظ تھیں۔ ان کو کامل مذہبی آزادی حاصل تھی۔ ان کے گرجے اور معبد بالکل مصئون تھے اور دشمنوں کے حملوں سے ان کی حفاظت مسلمانوں کے ذمہ تھی۔

فتح دمشق کے وقت ایک ایسا واقعہ پیش آیا جسے بڑے بڑے مقنن اور سیاست داں سنتے ہیں اور انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ مسلم افواج دمشق کا محاصرہ کئے ہوئے تھیں۔ ایک طرف حضرت خالدؓ تھے۔ دوسری طرف ابو عبیدہؓ۔ حضرت خالدؓ ایک رات خندق پار کر کے قلعہ کی دیوار پر چڑھ گئے'

نیچے اتر کر دروازہ کھول دیا اور مسلم فوج درانہ شہر میں گھس آئی۔ عیسائیوں نے جب یہ کیفیت دیکھی تو فوراً دوسری طرف جا کر چپکے سے حضرت ابو عبیدہؓ سے صلح کر لی۔ چنانچہ ایک طرف سے حضرت خالدؓ بحیثیت فاتح شہر میں بڑھتے چلے گئے اور دوسری طرف سے ابو عبیدہؓ بحیثیت حلیف بڑھتے آئے' وسط شہر میں دونوں فریق آملے۔ نصف شہر بہرحال لڑائی میں فتح ہوا تھا اور اس حصہ کے ساتھ ان شرائط کے ماتحت سلوک ہونا چاہئے تھا جو بحیثیت فاتح اہل دمشق سے بعد میں طے ہوئیں۔ لیکن حضرت ابو عبیدہؓ نے کہا کہ چونکہ انہوں نے اہل شہر سے صلح کر لی ہے اور وہ انہیں امان دے چکے ہیں اس لئے ان سب کو حلیف ہی شمار کرنا چاہئے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اہل شہر سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا گیا۔ حالانکہ ایفائے عہد کے متعلق یونان کے مقنن اعظم سولن نے لکھا ہے " معاہدہ مکڑی کا جالا ہے جو اپنے سے کمزور کو الجھا لیتا ہے اور اپنے سے قوی کے سامنے ٹوٹ جاتا ہے"۔

جب مسلمانوں کی افواج وادی جروان میں پہنچیں تو وہاں کے عیسائیوں نے حضرت ابو عبیدہؓ کو لکھا کہ :-

"اے مسلمانو ! ہم تمہیں بازنطینی حکمرانوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ ہمارے ہم مذہب ہیں۔ اس لئے کہ تم معاملہ میں ان سے کہیں بہتر ہو اور ہم سے ہمیشہ عدل و انصاف سے پیش آتے ہو اور تمہاری حکومت ان سے بدرجہا اچھی ہے کہ انہوں نے تو ہمارے گھر بار ہم سے چھین لئے"۔

حمص میں مسلمانوں نے کچھ عرصہ تک اپنی چھاؤنی رکھی۔ عیسائیوں کی افواج نے جب دوبارہ حملہ کیا تو حمص کے عیسائیوں نے اپنے شہر کے دروازے بند کر لئے اور ان سے کہہ دیا کہ جاؤ تم سے ان مسلمانوں کی حکومت ہزار درجہ بہتر ہے۔ چنانچہ جب مسلمانوں کو فوجی ضرورت کے ماتحت کسی دوسری جگہ منتقل ہونا پڑا تو اہل شہر روتے تھے اور التجائیں کرتے تھے کہ خدا کے لئے جلدی واپس آنا کہ کہیں رومن عیسائی پھر ہم پر حکومت کرنے کو نہ آجائیں۔ اللہ اللہ!

تو نخل خوش ثمرے کیستی کہ باغ و چمن
ہمہ از خویش بریدند و با تو پیوستند

اسی حمص کا واقعہ ہے کہ مسلمانوں نے ان سے سال بھر کا خراج وصول کیا۔ لیکن چھ مہینہ بعد انہیں دوسری جگہ جانا پڑ گیا تو حضرت عمرؓ نے حکم بھیجا کہ نصف خراج اہل شہر کو واپس کر دو کہ جب ان کی حفاظت ہی نہیں تو اس حفاظت کے بدلے میں خراج کیسا؟ کیا ایسی مثال کسی اور تاریخ میں آپ کو مل سکتی ہے؟

جبلہ بن ایہم کا واقعہ مشہور ہے کہ جب طواف کعبہ کے دوران میں اس کی چادر ایک اعرابی کے پاؤں تلے آگئی تو اس نے اعرابی کے منہ پر طمانچہ مارا' اعرابی نے فوراً اس کا جواب ویسے ہی طمانچہ میں دیا۔ شہزادہ جبلہ نے حضرت عمرؓ کے سامنے اس کی شکایت کی۔ لیکن حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اسلام کے نزدیک تو ایک شہزادہ اور ایک ادنیٰ دہقانی کا ایک درجہ ہے تو اس نے پھر سے عیسائی ہو جانا چاہا اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہاں ہمارے نزدیک تو تمہارے لئے تینوں راستے کھلے ہیں۔ یا مسلمان رہو یا عیسائی ہو کر جزیہ ادا کرو یا جہاں جی چاہے چلے جاؤ۔ چنانچہ وہ اپنی تیس ہزار فوج کے ساتھ ایشیائے کوچک کی طرف چلا گیا۔

سب سے بڑا الزام جزیہ کے متعلق عائد کیا جاتا ہے اور ظاہر یہ کیا جاتا ہے کہ غیر مسلم رعایا سے یہ "جرمانہ" ان کے مسلمان نہ ہونے کے جرم کی بنا پر وصول کیا جاتا تھا۔ حالانکہ اس کی حقیقت بالکل جداگانہ ہے۔ مسلمانوں کو اپنی آمدنی کا چالیسواں حصہ حکومت کو ادا کرنا پڑتا تھا اور اس کے علاوہ ہر قسم کی فوجی خدمت بھی ان کے ذمہ تھی۔ غیر مسلم رعایا جو مسلمانوں کے زیر حکومت رہتی تھی ان کی حفاظت کی ذمہ داری مسلمان حکومت پر لازم تھی۔ وہ فوجی خدمت سے مستثنیٰ تھے۔ اگر ان سے اس حفاظت کے اخراجات کی مد میں کچھ وصول کر لیا جائے جو مسلمانوں کی زکوٰۃ سے بھی کم تھا تو اس میں اندھیر کیا ہے؟ عورتیں بچے بوڑھے اپاہج اور مذہبی رہنما اس سے مستثنیٰ تھے۔

اور پھر اس جزیہ کی مقدار کتنی تھی؟ معمولی حیثیت والے سے 2 روپے سالانہ' متوسط درجہ والے سے 8 اور اس سے آگے خواہ کوئی کروڑ پتی ہو زیادہ سے زیادہ بارہ روپے سالانہ۔ حالانکہ ایک کروڑ پتی مسلمان سے کم از کم اڑھائی لاکھ روپیہ سالانہ بطور زکوٰۃ وصول کیا جائے گا۔ صدقات و خیرات اس کے علاوہ ہوں گے اور اس مالی قربانی کے ساتھ ساتھ جب ضرورت لاحق ہو گی تو یہ جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان جنگ میں بھی شریک ہو گا اور ذمی رعایا کے مال' جان' مذہب' معابد کی حفاظت کرے گا۔ یعنی ایک ذمی رئیس بارہ روپیہ ادا کر کے نہایت اطمینان سے اپنے گھر میں بیٹھا رہیگا اور اسی حیثیت کا ایک مسلمان اڑھائی لاکھ روپیہ ادا کرنے کے بعد' اس ذمی کے محافظ کی حیثیت سے میدان کار زار میں دشمن کی شمشیر و سنان کا مقابلہ بھی کریگا۔ دشمن کی گولیاں ہوں گی اور مسلمانوں کا سینہ جو غیر مسلم رعایا کی حفاظت کے لئے سپر کا کام دیگا۔ مسلمانوں سے پیشتر ساسانیوں نے عیسائی رعایا پر جو ٹیکس لگا رکھا تھا وہ ساسانی رعایا سے دگنا ہوتا تھا اور اس کے جواز میں شاہ ساپر دوئم نے کہا تھا کہ لڑائی ہمیں لڑنی پڑتی ہے اور یہ مزے میں بیٹھے رہتے ہیں' دگنا کیوں نہ ادا کریں؟ مسلمانوں کے عہد حکومت میں جب کوئی غیر مسلم فوجی خدمت کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دیتا تو اس سے جزیہ نہیں لیا جاتا تھا۔ چنانچہ جراجمہ کے عیسائی قبیلہ نے اس رعایت سے فائدہ اٹھایا۔ اہل حیرہ نے جزیہ دیا تو ان سے یہ شرط تھی کہ ان پر خواہ مسلمان حملہ آور ہوں خواہ غیر مسلم ان کی حفاظت مسلمانوں کے ذمہ ہو گی اور ہم حمص کے واقعہ میں دیکھ چکے ہیں کہ جب مسلمان حفاظت کی ذمہ داری سے سبک دوش ہوئے تو باقی ماندہ زر جزیہ ذمیوں کو واپس کر دیا۔ کیا اس کے بعد بھی یہی سمجھا جائے گا کہ جزیہ غیر مسلموں سے اسلام قبول نہ کرنے کے جرم کی پاداش میں وصول کیا جاتا ہے؟

ذمیوں کے حقوق کا مسلمانوں کو اس قدر خیال رہتا تھا کہ حضرت عمرؓ کے آخری الفاظ یہ تھے۔

"میں ذمیوں کے حقوق اب اپنے جانشین کے سپرد کرتا ہوں۔ ان کو خدا اور رسولؐ نے پناہ دے رکھی ہے' اس لئے میرے جانشین کو خیال رکھنا چاہئے کہ جو معاہدے ان کے ساتھ ہوئے ہیں ان پر شدت سے پابندی ہو اور ان پر کسی قسم کا زائد بوجھ نہ ڈالا جائے۔

حضرت عمرؓ کے خلاف بعض الزامات عائد کئے جاتے ہیں کہ انہوں نے مذہب کے معاملہ میں

عیسائیوں پر کچھ پابندیاں عائد کر رکھی تھیں لیکن سر تھامس آرنلڈ نے (Caetin.) وغیرہ کے حوالہ سے اس کی تحقیق کی ہے کہ یہ تمام الزامات بعد کی اختراع ہیں اور ابن حزم سے پہلے ان کا ذکر بھی نہیں ملتا۔ اس کے برعکس یہ واقعات بھی حضرت عمرؓ کے عہد کے ہیں کہ انہوں نے ذمیوں کے جان و مال کو مسلمانوں کے جان و مال کے برابر قرار دیا اور اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کر دیتا تو حضرت عمرؓ اس مسلمان کو ذمی کے قتل کے بدلے میں قتل کرا دیتے۔ انہوں نے تمام زمینیں ذمیوں کے قبضہ میں رہنے دیں اور یہ حکم دے دیا کہ کوئی مسلمان کسی ذمی کی زمین کو خرید نہیں سکتا۔ ذمیوں کے علاقہ کے متعلق کوئی معاملہ پیش آتا تو انہی کے نمائندوں سے اس کے بارہ میں مشاورت ہوتی۔ قاعدہ تھا کہ جو شخص اپاہج اور ضعیف ہو جاتا اور محنت و مزدوری سے کسب معاش نہ کر سکتا تو اس کے لئے بیت المال سے کچھ وظیفہ مقرر ہو جاتا۔ مساوات کی یہ انتہا ہے کہ اس رعایت میں مسلمانوں کے ساتھ ذمی بھی برابر کے شریک تھے۔ چنانچہ ابن ولید نے حیرہ کے ذمیوں کے ساتھ جو معاہدہ کیا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے اس میں یہ شرط بھی داخل تھی۔ خلافت راشدہ کے بعد اگرچہ حکومت ملوکیت میں تبدیل ہو گئی، لیکن روح اسلامی ابھی مسلمانوں میں موجود تھی۔ چنانچہ عہد بنی امیہ اور عہد عباسیہ میں بھی ہمیں مذہبی رواداری کے درخشندہ واقعات صاف صاف نظر آتے ہیں۔ خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے حکم دے رکھا تھا کہ کوئی گرجا، کوئی صومعہ گرایا نہ جائے۔

خلیفہ ہشام کے لڑکے نے ایک مرتبہ شکایت کی کہ ایک مسلمان کو ایک عیسائی نے مارا ہے۔ خلیفہ نے کہا کہ اس سے کہو کہ عدالت میں جا کر چارہ جوئی کرے۔ مسلمان اور عیسائی کی تمیز کیسی۔

خلیفہ المامون کے وقت میں ایک پادری یزوان بخت دربار میں آیا، مسلمانوں سے اس نے مباحثہ کیا اور ہار گیا۔ خلیفہ نے کہا اب مسلمان ہو جاؤ۔ اس نے کہا زبردستی یا اپنی مرضی سے۔ خلیفہ نے کہا اپنی مرضی سے اس میں زبردستی کوئی نہیں۔ اس نے کہا پھر تو میں مسلمان نہیں ہوتا۔ چنانچہ خلیفہ نے حکم دیا کہ اسے فوجی حفاظت میں اس کی جائے پناہ تک پہنچا دیا جائے، مبادا کوئی نادان اسے نقصان پہنچا دے۔

عہد عباسیہ میں نسٹورین فرقہ کے عیسائیوں کے ساتھ مسلمانوں کی ایک جماعت کا تنازعہ ہو گیا۔ ایک مسلمان مارا گیا جس سے مشتعل ہو کر مسلمانوں نے ان کے گرجے پر حملہ کر دیا۔ گرجے کو اتفاقیہ آگ لگ گئی۔ عیسائیوں نے مسلمان قاضی کی عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا۔ چنانچہ ابو حامد اسفرائینی اور ابوبکر خوارزمی جیسے جلیل القدر مقنین کی رائے سے یہ فیصلہ ہوا کہ جس شخص نے گرجے پر حملہ کرنے میں سابقت کی ہے وہ مجرم ہے، اسے اس کے جرم کی سزا دی جائے۔ ان واقعات سے اس زمانہ کی عام مذہبی آزادی کا پتہ چل سکتا ہے۔

مصر میں سلطان صلاح الدین کے وقت میں عیسائی اچھے اچھے عہدوں پر متمکن تھے۔ سیکرٹری۔ اکاؤنٹنٹ۔ رجسٹرار بالعموم عیسائی ہوتے تھے۔ مسٹر لارنس ای براؤن نے لکھا ہے کہ مصر میں عیسائیوں پر سوائے خلیفہ الحام کے عہد کے جو درحقیقت دیوانہ قرار دیا جاتا تھا کبھی ظلم و ستم نہ ہوا اور جہاں کہیں عیسائیوں نے کچھ مصیبتیں اٹھائیں وہ ان کی باہمی خانہ جنگیوں کی وجہ سے تھیں۔ جنگ صلیبی کے وقت بہت

میں شریک ہوں تو کیا وہ سب کے سب قصاص میں مارے جائیں گے۔ مفتی نے جواب دیا کہ بے شک دس نہیں ایک ہزار بھی۔

اگرچہ یہ شہادتیں تاریخی اعتبار سے کچھ کم وقیع نہیں لیکن عہد اسلامی میں غیر مسلم رعایا کی حالت کے متعلق کچھ ایسے بیانات بھی موجود ہیں جن پر کسی خارجی اثر۔ یک طرفہ میلان و رجحان یا کسی دباؤ کا امکان نہیں ہو سکتا۔ اس زمانے کے بعض عیسائی بطریق اور دیگر پادری اپنے اسقف وغیرہ کو خفیہ خطوط لکھتے رہتے تھے۔ اتفاق سے ان میں سے بعض خطوط دست یاب ہو گئے ہیں جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائی رعایا فی الواقع مسلمانوں کے عہد حکومت سے مطمئن اور خوش تھی۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر انہیں کچھ بھی تکلیف ہوتی تو وہ اس کو بڑھا چڑھا کر کیوں نہ لکھتے۔ ہم ان خطوط میں سے بعض کے اقتباسات ذیل میں درج کرتے ہیں۔

بطریق ایشوب سویم دیوار وشیر (فارس) کے سامین کے نام ایک خط کے دوران میں لکھتا ہے :-

• "یہ طے یا عرب جن کو خدا نے اس زمین کی حکومت عطا کی ہے آپ کو علم ہی ہے کہ اب ہمارے پاس رہتے ہیں لیکن انہوں نے کبھی ہمارے مذہب پر حملہ نہیں کیا بلکہ ہمیشہ ہمارے مذہب کی عزت کرتے ہیں۔ ہمارے پادریوں اور خدائے مسیح کے اولیاء کی تعظیم کرتے ہیں' ان کے کلیساؤں اور خانقاہوں پر ان کی طرف سے الطاف و اکرام کا سلوک کیا جاتا ہے۔"

چوں کہ اس بطریق کا زمانہ قریباً 647ء لغایت 660ء ہے اس لئے مصرحہ بالا خط حضرت عثمانؓ یا حضرت علیؓ کے عہد حکومت میں لکھا گیا ہو گا۔

یروشلم کے فرقہ مالکی کا ایک بطریق قسطنطنیہ کے بطریق کے نام ایک خط میں رقم طراز ہے :-

"مسلمان عادل ہیں اور ہم سے نہ کوئی بے انصافی کرتے ہیں اور نہ ہی کسی قسم کی زیادتی روا رکھتے ہیں۔"

اسی طرح نزبن کے، میٹروپولٹین الیاس نے 1008-9ء میں لکھا ہے :-

"مسلمانوں کے متعلق ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ ان کی اطاعت اور محبت دیگر مذاہب کے لوگوں کی اطاعت سے زیادہ ہم کو متاثر کرتی ہے خواہ ہم ان کی رعایا ہوں یا نہ ہوں اور خواہ وہ ہم سے کیسا ہی سلوک کیوں نہ کریں۔ اور یہ اس لئے کہ مسلمان اسے اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے ہیں کہ ہماری حفاظت کریں اور ہم سے نیک سلوک کریں۔ اور ان کا عقیدہ ہے کہ ان میں سے جو کوئی غیرمذہب والے کو ستائے گا نبی اکرمؐ قیامت کے دن اس مسلمان سے مواخذہ کریں گے۔ ان کا قانون ہمارے حقوق کو تسلیم کرتا ہے اور ہمیں دیگر مذاہب سے متمیز قرار دیتا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ کسی مسلمان نے جب کبھی ہم سے زیادتی کی ہے تو اس کے قانون نے اسے بتا دیا ہے کہ اس نے یہ ناجائز کام کیا ہے۔ برعکس اس کے دوسرے مذاہب کے متبعین میں سے کسی نے اگر ہماری عزت کی ہے یا ہم سے نیک سلوک کیا ہے تو اسے اس کے قانون نے بتایا ہے کہ اس نے یہ اچھا کام نہیں کیا۔ لہٰذا مسلمانوں نے اگر کہیں ہم پر زیادتی بھی کی ہے تو ان کے اس اعتراف کی بنا پر کہ انہوں نے یہ مستحسن کام نہیں کیا ان کی زیادتی ہمارے لئے دیگر اہل مذاہب کے حسن سلوک سے کہیں بہتر ہے کہ جس سلوک کی

میں شریک ہوں تو کیا وہ سب کے سب قصاص میں مارے جائیں گے۔ مفتی نے جواب دیا کہ بے شک دس نہیں ایک ہزار بھی۔

اگرچہ یہ شہادتیں تاریخی اعتبار سے کچھ کم وقیع نہیں لیکن عہد اسلامی میں غیر مسلم رعایا کی حالت کے متعلق کچھ ایسے بیانات بھی موجود ہیں جن پر کسی خارجی اثر۔ یک طرفہ میلان و رجحان یا کسی دباؤ کا امکان نہیں ہو سکتا۔ اس زمانے کے بعض عیسائی بطریق اور دیگر پادری اپنے اسقف وغیرہ کو خفیہ خطوط لکھتے رہتے تھے۔ اتفاق سے ان میں سے بعض خطوط دست یاب ہو گئے ہیں جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائی رعایا فی الواقع مسلمانوں کے عہد حکومت سے مطمئن اور خوش تھی۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر انہیں کچھ بھی تکلیف ہوتی تو وہ اس کو بڑھا چڑھا کر کیوں نہ لکھتے۔ ہم ان خطوط میں سے بعض کے اقتباسات ذیل میں درج کرتے ہیں۔

بطریق ایشوب سویم دیوار وشیر (فارس) کے سامین کے نام ایک خط کے دوران میں لکھتا ہے :-

• "یہ طے یا عرب جن کو خدا نے اس زمین کی حکومت عطا کی ہے آپ کو علم ہی ہے کہ اب ہمارے پاس رہتے ہیں لیکن انہوں نے کبھی ہمارے مذہب پر حملہ نہیں کیا بلکہ ہمیشہ ہمارے مذہب کی عزت کرتے ہیں۔ ہمارے پادریوں اور خدائے مسیح کے اولیاء کی تعظیم کرتے ہیں' ان کے کلیساؤں اور خانقاہوں پر ان کی طرف سے الطاف و اکرام کا سلوک کیا جاتا ہے۔"

چوں کہ اس بطریق کا زمانہ قریباً 647ء لغایت 660ء ہے اس لئے مصرحہ بالا خط حضرت عثمانؓ یا حضرت علیؓ کے عہد حکومت میں لکھا گیا ہو گا۔

یروشلم کے فرقہ مالکی کا ایک بطریق قسطنطنیہ کے بطریق کے نام ایک خط میں رقم طراز ہے :-

"مسلمان عادل ہیں اور ہم سے نہ کوئی بے انصافی کرتے ہیں اور نہ ہی کسی قسم کی زیادتی روا رکھتے ہیں۔"

اسی طرح نزبن کے، میٹروپولیٹن الیاس نے 1008-9ء میں لکھا ہے :-

"مسلمانوں کے متعلق ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ ان کی اطاعت اور محبت دیگر مذاہب کے لوگوں کی اطاعت سے زیادہ ہم کو متاثر کرتی ہے خواہ ہم ان کی رعایا ہوں یا نہ ہوں اور خواہ وہ ہم سے کیسا ہی سلوک کیوں نہ کریں۔ اور یہ اس لئے کہ مسلمان اسے اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے ہیں کہ ہماری حفاظت کریں اور ہم سے نیک سلوک کریں۔ اور ان کا عقیدہ ہے کہ ان میں سے جو کوئی غیرمذہب والے کو ستائے گا نبی اکرمؐ قیامت کے دن اس مسلمان سے مواخذہ کریں گے۔ ان کا قانون ہمارے حقوق کو تسلیم کرتا ہے اور ہمیں دیگر مذاہب سے متمیز قرار دیتا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ کسی مسلمان نے جب کبھی ہم سے زیادتی کی ہے تو اس کے قانون نے اسے بتا دیا ہے کہ اس نے یہ ناجائز کام کیا ہے۔ برعکس اس کے دوسرے مذاہب کے متبعین میں سے کسی نے اگر ہماری عزت کی ہے یا ہم سے نیک سلوک کیا ہے تو اسے اس کے قانون نے بتایا ہے کہ اس نے یہ اچھا کام نہیں کیا۔ لہٰذا مسلمانوں نے اگر کہیں ہم پر زیادتی بھی کی ہے تو ان کے اس اعتراف کی بنا پر کہ انہوں نے یہ مستحسن کام نہیں کیا ان کی زیادتی ہمارے لئے دیگر اہل مذاہب کے حسن سلوک سے کہیں بہتر ہے کہ جس سلوک کی

گیارھویں اور تیرھویں صدی تک غیر مسلم رعایا کے تیوہاروں کی تقریب میں شہر کے بازار آراستہ کئے جاتے اور یہ تیوہار بڑی دھوم سے منائے جاتے۔

اسلام کی تعلیم کا کچھ ایسا تحیر انگیز اثر ہے کہ وہ گویا انسان کی فطرت ہی بدل دیتی ہے۔ چنگیز خاں اور ہلاکو خاں کے چغتائی اور منگول قبائل تاریخ عالم میں وحشت و بربریت کے مجسمے تصور کئے جاتے ہیں۔ ہر زبان میں ان کا نام آتش و خون کے حروف میں لکھا جاتا ہے۔ اس سے ان کے مذہبی تعصب و جنون کا اندازہ لگا لیجئے۔ چنگیز خاں اور ہلاکو خاں کے عہد حکومت میں یہ حکم عام تھا کہ جو شخص مسلمانوں کے طریق پر کوئی جانور ذبح کرے' ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اسے قتل کر دے۔ لیکن یہی قبائل جب اسلام کے آغوش میں آئے تو ان کی مذہبی رواداری کی یہ کیفیت تھی کہ ازبک خاں نے پیٹر کے اسقف' کے نام 1313ء میں ایک منشور لکھا جس میں درج تھا کہ کوئی شخص حدود سلطنت کے اندر کسی عیسائی کے گرجا کو نقصان نہ پہنچائے گا۔ اس کی جائداد نہیں چھینے گا اور اس کے مذہب سے قطعاً" تعرض نہیں کرے گا۔ جو ایسا کرے گا' وہ حکومت کی جانب سے سزا کا مستوجب ہو گا اور اپنے خدا کے حضور اس کا جواب دہ"۔

ہندوستان کے متعلق کچھ زیادہ تفصیل سے لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ یہاں مسلمانوں کے عہد حکومت میں مذہبی رواداری کا زندہ ثبوت خود یہاں کی مردم شماری ہے۔ ہندوستان میں قریب ایک ہزار سال تک مسلمانوں نے حکومت کی اور اس میں ایسے ایسے وقت بھی آئے کہ کشمیر سے میسور تک اور گجرات سے بنگال تک ایک ہی مسلمان بادشاہ کا سکہ رواں تھا۔ لیکن بایں ہمہ سلطنت مغلیہ کے اختتام پر مسلمانوں کی تعداد تین کروڑ سے کم تھی۔ اور جب "تلوار" ہاتھ سے نکل گئی تو اس اسی سال کے عرصہ میں وہ تین گنا ہو گئی۔ ان اعداد و شمار سے اگر وہ تعداد خارج کر دی جائے جو غیر ہندی مسلمانوں اور ان کی اولاد پر مشتمل ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی پیش نظر رہے کہ ہندوستان میں کس قدر اسلامی مبلغ آئے اور انہوں نے غیر مسلم باشندوں کے دلوں میں کس قدر گہری عقیدت پیدا کر لی تو شمشیر بیچاری کے حصوں میں سوائے بدنامی کے اور کیا رہ جاتا ہے۔

سب سے پہلے حجاج کے عہد میں غازی محمد بن قاسم کے زیر قیادت مسلمان سندھ میں آئے۔ سر ولیم میور لکھتا ہے کہ "اس وقت مسلمانوں نے ہندوؤں کے تمام مندر اسی طرح رہنے دیئے' ان کو بت پرستی سے بہ جبر نہیں روکا۔ یہود۔ نصاریٰ پارسی سب کو اجازت تھی کہ اپنے اپنے مذہب پر قائم رہیں اور یہی وجہ ہے کہ باوجود اسلامی حکومت کے ہندوستان غیر مسلم ہی رہا۔ محمود غزنوی کے حملے مسلم جور و استبداد کے لئے بطور ضرب المثل استعمال کئے جاتے ہیں' لیکن انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کا عیسائی مدیر ان تمام حملوں کے تذکرہ کے بعد لکھتا ہے کہ :-

"محمود نے مذہب کے بارے میں کہیں زبردستی نہیں کی بلکہ کئی جگہ اس نے اپنے اہل مذہب پر ہندوؤں کو ترجیح دی"

اسی طرح لالہ تلسی رام صاحب اپنی کتاب "واقعات ہند" میں لکھتے ہیں :-

"محمود نے بہ جبر کسی کو مسلمان نہیں بنایا نہ کسی ہندو کو اس لئے قتل کیا کہ وہ ہندو ہے"

گیارھویں اور تیرھویں صدی تک غیر مسلم رعایا کے تیوہاروں کی تقریب میں شہر کے بازار آراستہ کئے جاتے اور یہ تیوہار بڑی دھوم سے منائے جاتے۔

اسلام کی تعلیم کا کچھ ایسا تحیر انگیز اثر ہے کہ وہ گویا انسان کی فطرت ہی بدل دیتی ہے۔ چنگیز خاں اور ہلاکو خاں کے چغتائی اور منگول قبائل تاریخ عالم میں وحشت و بربریت کے مجسمے تصور کئے جاتے ہیں۔ ہر زبان میں ان کا نام آتش و خون کے حروف میں لکھا جاتا ہے۔ اس سے ان کے مذہبی تعصب و جنون کا اندازہ لگا لیجئے۔ چنگیز خاں اور ہلاکو خاں کے عہد حکومت میں یہ حکم عام تھا کہ جو شخص مسلمانوں کے طریق پر کوئی جانور ذبح کرے' ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اسے قتل کر دے۔ لیکن یہی قبائل جب اسلام کے آغوش میں آئے تو ان کی مذہبی رواداری کی یہ کیفیت تھی کہ ازبک خاں نے پیٹر کے اسقف' کے نام 1313ء میں ایک منشور لکھا جس میں درج تھا کہ کوئی شخص حدود سلطنت کے اندر کسی عیسائی کے گرجا کو نقصان نہ پہنچائے گا۔ اس کی جائداد نہیں چھینے گا اور اس کے مذہب سے قطعاً" تعرض نہیں کرے گا۔ جو ایسا کرے گا' وہ حکومت کی جانب سے سزا کا مستوجب ہو گا اور اپنے خدا کے حضور اس کا جواب دہ"۔

ہندوستان کے متعلق کچھ زیادہ تفصیل سے لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ یہاں مسلمانوں کے عہد حکومت میں مذہبی رواداری کا زندہ ثبوت خود یہاں کی مردم شماری ہے۔ ہندوستان میں قریب ایک ہزار سال تک مسلمانوں نے حکومت کی اور اس میں ایسے ایسے وقت بھی آئے کہ کشمیر سے میسور تک اور گجرات سے بنگال تک ایک ہی مسلمان بادشاہ کا سکہ رواں تھا۔ لیکن بایں ہمہ سلطنت مغلیہ کے اختتام پر مسلمانوں کی تعداد تین کروڑ سے کم تھی۔ اور جب "تلوار" ہاتھ سے نکل گئی تو اس اسی سال کے عرصہ میں وہ تین گنا ہو گئی۔ ان اعداد و شمار سے اگر وہ تعداد خارج کر دی جائے جو غیر ہندی مسلمانوں اور ان کی اولاد پر مشتمل ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی پیش نظر رہے کہ ہندوستان میں کس قدر اسلامی مبلغ آئے اور انہوں نے غیر مسلم باشندوں کے دلوں میں کس قدر گہری عقیدت پیدا کر لی تو شمشیر بیچاری کے حصوں میں سوائے بدنامی کے اور کیا رہ جاتا ہے۔

سب سے پہلے حجاج کے عہد میں غازی محمد بن قاسم کے زیر قیادت مسلمان سندھ میں آئے۔ سر ولیم میور لکھتا ہے کہ "اس وقت مسلمانوں نے ہندوؤں کے تمام مندر اسی طرح رہنے دیئے' ان کو بت پرستی سے بہ جبر نہیں روکا۔ یہود۔ نصاریٰ پارسی سب کو اجازت تھی کہ اپنے اپنے مذہب پر قائم رہیں اور یہی وجہ ہے کہ باوجود اسلامی حکومت کے ہندوستان غیر مسلم ہی رہا۔ محمود غزنوی کے حملے مسلم جور و استبداد کے لئے بطور ضرب المثل استعمال کئے جاتے ہیں' لیکن انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کا عیسائی مدیر ان تمام حملوں کے تذکرہ کے بعد لکھتا ہے کہ :-

"محمود نے مذہب کے بارے میں کہیں زبردستی نہیں کی بلکہ کئی جگہ اس نے اپنے اہل مذہب پر ہندوؤں کو ترجیح دی"

اسی طرح لالہ تلسی رام صاحب اپنی کتاب "واقعات ہند" میں لکھتے ہیں :-

"محمود نے بہ جبر کسی کو مسلمان نہیں بنایا نہ کسی ہندو کو اس لئے قتل کیا کہ وہ ہندو ہے"

ڈاکٹر بریز اپنے سفر نامہ میں لکھتے ہیں :-

"مسلمانوں کی تدبیر مملکت کا یہ ایک جزو ہے کہ وہ ہندوؤں کی خصوصیات میں جن کی تعداد مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہے دست اندازی کرنا مناسب نہیں سمجھتے بلکہ ان کے مذہبی رسوم کو بجا لانے میں ان کو آزادی دیتے ہیں"۔

اکبر کے عہد میں یہ رواداری تو گویا جانب داری کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ راجہ مان سنگھ کو مثلاً وہ اقتدار حاصل تھا جو شاید پرتھوی راج کو بھی نصیب نہ ہوا ہو۔ راجہ ٹو ڈرمل وغیرہ کی قدر و منزلت کسی صورت میں بکھا جیت کے نو رتنوں سے کم نہ تھی۔ مذہبی آزادی کے متعلق رائے بہادر لالہ بج ناتھ اپنی کتاب "ہندوستان گذشتہ و حال" میں تحریر فرماتے ہیں۔

"مسلمان فرماں رواؤں کی نسبت یہ اعتراض بھی پیش کیا جاتا ہے کہ ان کے عہد میں نئے مندر بننے کی اجازت نہ تھی لیکن یہ سراسر غلط ہے دہلی' آگرہ' متھرا وغیرہ میں جو اسلامی قوت و سطوت کے خاص مرکز تھے۔ بہت سے مندر شاہان اسلام کے عہد کے تعمیر شدہ اس وقت تک موجود ہیں"۔

اورنگ زیب کے تو نام سے ہی ایک خونچکاں منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ کم از کم اس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ جب تک سوا من زنار نہیں اتروا لیتا تھا کھانا نہیں کھایا کرتا تھا۔

"اورنگ زیب کو خبر پہنچی کہ بنارس کے بعض حکام برہمنوں کو ستاتے ہیں تو اس نے ابو الحسن گورنر بنارس کو فرمان بھیجا کہ ہماری شریعت کا حکم ہے کہ مندر نہ ڈھائے جائیں اور ان کے پجاریوں پر سختی نہ کی جائے لہٰذا یہ حکم دیا جاتا ہے کہ کوئی شخص کسی برہمن یا ہندو پر کسی قسم کا دباؤ نہ ڈالے۔

اسی طرح بابو رام نرائن صاحب مینجر ریاست رام نگر اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں۔

"ضلع سیتا پور میں معرکہ کے مندر کو عالمگیر نے چند مواضعات جاگیر میں دیئے جو اب تک موجود ہیں۔ نیز متھرا کے نزدیک بلدیو راؤ کے مندر کو بہت سے گاؤں جاگیر میں دیئے"

بابو منوہر لال صاحب اوہری اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں :-

"اورنگ زیب نے مندروں کو جاگیریں دیں اس کے بڑے بڑے عہدہ دار ہندو تھے"

پروفیسر ایشوری پرشاد صاحب اپنی "تاریخ ہند" میں لکھتے ہیں :-

"ملتان میں تو تلہ مائی کے مندر کو ایک سو روپیہ سالانہ جاگیر عالمگیر نے عطا فرمائی۔ ڈیرہ دون کے گوردوارہ کو جاگیر دی۔ ہندوؤں پر سے محصول جاترہ جو پہلے سے چلا آتا تھا موقوف کر دیا"۔

سکھ حضرات کے ہاں تو "اورنگا" کے مظالم کی داستانیں ہر تقریب پر دہرائی جاتی ہیں اور ان میں گورو گوبند سنگھ جی کے واقعات کو سب سے زیادہ نمایاں کیا جاتا ہے لیکن رائے بہادر کنہیا لال اپنی "تاریخ پنجاب" میں لکھتے ہیں :-

"گورو گوبند سنگھ جی نے محاصرہ کے بعد اورنگ زیب کو فارسی میں عرضی لکھی کہ میں سیاست سے الگ ہو کر عبادت کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ بادشاہ نے لکھا کہ اگر ایسا ہے تو آپ سے کوئی مزاحمت نہیں کی جائے گی۔ چنانچہ اس نے تمام حکام کو اس کے مطابق احکام جاری کر

دیئے"۔

متاخرین میں سے حیدر علی اور سلطان ٹیپو بھی اس بارے میں بھی بہت بدنام کئے جاتے ہیں کہ انہوں نے بہت سے ہندو خاندانوں کو مسلمان کر لیا ان کے متعلق سر تھامس آرنلڈ لکھتے ہیں کہ :-

"یہ تحقیق سے ثابت ہے کہ ان خاندانوں کا مسلمان ہونا ان بادشاہوں کے عہد سے بہت پہلے کا واقعہ ہے"۔

اسی حیدر علی کے دو وزیر برہمن تھے اور شاما برہمن اس کا معتمد خاص تھا۔

ملوکہ میں جو وشنو کا مندر ہے اس میں دو چاندی کے برتن ہیں جن پر یہ عبارت کندہ ہے۔ "یہ برتن ٹیپو سلطان کی طرف سے بطور ہدیہ مندر کو دیئے گئے"۔

ان واقعات کے دہرانے سے ہمارا مطلب یہ نہیں کہ ان مسلمان فرماں رواؤں کی وسعت نظر اور کشادہ دلی کے قصائد لکھے جائیں بلکہ کہنا صرف یہ ہے کہ چونکہ ان کے عہد حکومت میں اسلامی کلچر' اسلامی روایات اور اسلامی تعلیم کے کچھ آثار باقی تھے' اس لئے ان کا تقاضا تھا کہ غیر مذاہب والوں سے رواداری کا برتاؤ کیا جائے۔ تاریخ کے یہ صفحات آپ کے سامنے ہیں۔ غیر مسلم مصنفین کی شہادتیں موجود ہیں۔ ان کی روشنی میں مسلمانوں کے عہد حکومت پر نگاہ ڈالئے خواہ وہ عرب میں ہوں یا عجم میں' چین میں ہو یا ترکستان میں' مصر میں ہوں یا ہندوستان میں۔ چونکہ قرآن کریم کی تعلیم کا تقاضا تھا کہ کسی شخص پر محض اختلاف مذہب کی بناء پر کوئی زیادتی نہ کی جائے' اس لئے کسی کا ذاتی رجحان اور طبعی میلان کچھ ہی کیوں نہ ہو جب وہ قرآن کریم کو سامنے رکھ لیتا تھا تو عدل و انصاف سے اعراض نہیں کر سکتا تھا۔ جب عام مسلمانوں کی سلطنت میں غیر مسلموں کے ساتھ اس قسم کی مذہبی رواداری کا عملی ثبوت دیا جاتا تھا تو ظاہر ہے کہ جب دنیا میں صحیح معنوں میں خدا کی بادشاہت قائم ہو جائے تو اس وقت تمام نوع انسانی کو کس قدر آزادی مذہب اور حریت فکر حاصل ہو گی۔ غیر مذاہب کے حضرات اگر ان واقعات پر غور و فکر کی نگاہ ڈالیں تو وہ یقیناً اس نتیجہ پر پہنچ جائیں گے کہ اسلام کا دامن ان تمام خونی دھبوں سے پاک ہے جو اس کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں وہ دنیا کو امن و سلامتی کا پیغام دینے والا ہے اور کسی حالت میں بھی رشتہ عدل و انصاف کو ہاتھ سے چھوڑنے کی اجازت نہیں دیتا کہ اس کے خدا کا اعلان ہے کہ

لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى۔ (5:8)

کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے عدل نہ برتو۔ عدل کرو کہ وہ تقویٰ سے بہت قریب ہے۔

اور انہی واقعات کو دیکھنے کے بعد ایک عیسائی مصنف یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ :-

"تاریخ (کے واقعات) جو ہم نے اس کتاب کے صفحات پر بے نقاب کئے ہیں ظاہر کر رہے ہے کہ اسلام ایشیا کے عیسائیوں سے "بزور شمشیر" نہیں منوایا گیا۔ بلکہ اس کی اشاعت مسلمانوں کی روز افزوں ترقیوں کی وجہ سے ہوئی۔"

"صلیبی لڑائیاں لڑنے والوں کے دل میں سب سے پہلے آرزو یہ تھی کہ وہ جناب مسیح کے لئے بزور شمشیر ایک سلطنت حاصل کر لیں۔"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

از (لاہور)

مخلوط انتخابات اور پاکستان

راپریل 1996ء کو بشپ ہاؤس فیصل آباد میں
ان اقلیتی کانفرنس" میں تقریر کرتے ہوئے
ر ڈاکٹر جان جوزف' بشپ آف فیصل آباد
میں "قائداعظم نظریاتی فورم" قائم کرنے کی
پر زور دیتے ہوئے فرمایا:
یادی قومی ضرورت یہی ہے کہ پاکستان میں
یں' اصول اور قوانین رائج ہوں جو کہ
محمد علی جناح کے ذہن میں تھے' جن قدروں
رکھتے ہوئے آپ نے وطن عزیز پاکستان کی
تھی' جن اصولوں کا آپ نے 11 راگست کو
ان کیا تھا اور جن سمجھوتوں کے تحت
نے پاکستان کے لئے مسیحیوں' ہندوؤں اور
ں کے ووٹ حاصل کئے تھے' جس میں
ں کسی بھی اسمبلی کی قیادت' کوئی بھی پاکستانی
جس میں چیف جسٹس' بری' بحری اور ہوائی
کے سربراہ بلکہ خود پاکستان کے صدر اور
کے لئے مذہب کی نہیں بلکہ پاکستانی شہریت
ہو۔
پچھلے پچاس سال سے پاکستان میں رہ کر پاکستان
ت کرنے والی جماعتوں اور قوتوں نے
کے ان اصولوں کو چوہوں کی طرح کتر کر
ہے' اب ضرورت اس بات کی ہے کہ پاکستانی
ں بنیادی تبدیلیاں لائی جائیں۔ یہ زہریلے
چوہے' اس کشتی کے پیندے میں اپنے تیز دانتوں سے
سوراخ کر رہے ہیں جس میں ہم سب بیٹھے ہیں' اس
لئے ان کے بھگانے کا مستقل انتظام کرنا ہی پڑے
گا۔ تاکہ وطن عزیز کی کشتی ثابت اور سلامت
رہے۔" (ماہنامہ مکاشفہ مئی 96ء)

ڈاکٹر جان جوزف نے درست فرمایا کہ پاکستان
میں وہی قدریں' اصول اور قوانین رائج ہوں جو کہ
قائداعظم محمد علی جناح کے ذہن میں تھے۔ آیئے دیکھ
لیتے ہیں قائداعظم کے ذہن میں کیا تھا اور اس سے
اقلیتوں کے لئے دوہرے ووٹ کا جواز کس طرح نکلتا
ہے؟۔

پاکستان کا تصور پیش کرتے ہوئے حضرت علامہ
محمد اقبال نے 1930ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے الٰہ
آباد کے اجلاس میں فرمایا تھا:
"ہندوستان' دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک
ہے۔ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے
اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک
مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے"۔

اپنے اس موقف کی صداقت پر انہیں کس قدر
پختہ یقین تھا' اسے انہوں نے ان الفاظ میں بیان
فرمایا:
"ہندوستان کو حکومت خود اختیاری' زیر سایہ برطانیہ
ملے یا اس سے باہر' کچھ بھی ہو مجھے تو یہی نظر آتا
ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی

ریاست کا قیام' کم از کم' اس علاقے کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے"۔

انہوں نے مزید فرمایا:

"لہٰذا ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کے متعلق میرا یہ مطالبہ ہندوستان اور مسلمانان ہند' دونوں کے بہترین مفاد میں ہے۔ اس سے چونکہ اندرونی طاقتوں میں توازن پیدا ہو جائے گا' اس لئے ملک میں امن و امان قائم ہو جائے گا۔ یہ تو ہندوستان کا فائدہ ہو گا۔ اور اسلام کو موقع ملے گا کہ اس پر عربی ملوکیت سے جو غیر اسلامی اثرات غالب آ چکے ہیں یہ ان سے مخلصی حاصل کر لے اور اپنے شرعی قوانین' اپنی تعلیم اور اپنے کلچر کی تنظیم نو کر کے انہیں اپنی اصلی روح اور عصر حاضر کی ضروریات سے قریب تر لا سکے"۔

اس کے بعد قائداعظمؒ نے مسلسل اور پیہم پاکستان کے اس تصور اور نظریہ کو قوم کے سامنے ایسے واشگاف الفاظ میں پیش کیا کہ پاکستان کے قیام کے اغراض اور اس میں مجوزہ نظام حکومت سے متعلق کسی قسم کا ابہام نہیں رہتا۔ انہوں نے 1941ء میں اس مملکت کی انفرادیت سے متعلق حیدر آباد دکن کی عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبا کے سوال کا جواب ان واضح ترین الفاظ میں دیا۔

"اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہئے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً" نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی' نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست اور معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔" (اورینٹ پریس بحوالہ' روزنامہ انقلاب' لاہور' مورخہ 8 فروری 1942ء)

انہوں نے 1945ء میں ایڈورڈس کالج پشاور میں 27 نومبر کو کہا کہ:

"ہم دونوں قوموں میں صرف مذہب کا فرق نہیں۔ ہمارا کلچر ایک دوسرے سے الگ ہے' ہمارا دین' ہمیں ایک ایسا ضابطہ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ ہم اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں"۔

دسمبر 1943ء میں کراچی میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی آخری نشست سے خطاب کرتے ہوئے پہلے آپ نے خود ہی یہ سوال اٹھایا کہ

"وہ کون سا رشتہ ہے جس سے منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسد واحد کی طرح ہیں؟۔ وہ کون سی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے؟ وہ کون سا لنگر ہے جس سے اس امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے؟"

اور اس کے بعد خود ہی یہ جواب دیا کہ

"وہ بندھن' وہ رشتہ' وہ چٹان' وہ لنگر' خدا کی کتاب عظیم' قرآن مجید ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی۔ ایک خدا' ایک کتاب' ایک رسولؐ۔ فلہٰذا ایک قوم"۔

پیش کردہ نکات سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ مفکر پاکستان اور بانیٔ پاکستان کے نزدیک' پاکستان کے قیام سے مقصد' اس میں

اسلام کا تحفظ' اس کا احیاء اور اس اسلامی نظام کا قیام تھا جس کی حدود قرآن حکیم کے احکام اور اصولوں کی روشنی میں متعین کی جائیں۔

اب آئیں مملکت پاکستان' اس کے ایوان ہائے پارلیمان اور ان کے لئے طریق انتخاب کی طرف۔

ایوان ہائے پارلیمان' یعنی پاکستان کی دستور ساز اسمبلی اور سینٹ کی تشکیل کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اس میں منتخب ہو کر جانے والے ارکان' قوم کے لئے ایسے قوانین وضع کریں جن کے ذریعہ' اس مملکت کے قیام کے اغراض و مقاصد حاصل ہو سکیں۔ ہم ان اراکین کا' معاف فرمایئے گا' اس لئے انتخاب نہیں کرتے کہ یہ ہمارے گلی محلوں کی نالیاں درست کروائیں یا آب رسانی اور نکاسی آب کے منصوبے بنائیں۔ ان کے رکن پارلیمان اور سینٹ منتخب ہونے کا حقیقی مقصد قوم کے لئے قانون سازی کرنا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے۔ (یہ کسی اور جمہوری ملک کی طرح نہیں ہے کہ جس میں عوام کے مزعومہ نمائندوں یعنی ارکان پارلیمان کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ ان کے لئے جیسے قوانین بھی چاہیں' سادہ اکثریت سے بنا لیں)۔ اس میں انہیں مملکت کے لئے قانون سازی ان حدود کے اندر رہتے ہوئے' جو ان مقاصد کے حصول کے لئے ضروری ہوں' کرنا ہے۔ اور ہمارے وہ مقاصد ایسے معاشرہ کا قیام ہے جس میں اسلام کا تحفظ' اس کا احیاء اور اس کے اصولوں کے مطابق ہر فرد معاشرہ کی زندگی کو ان اصول و احکام کے سواحل کے اندر لایا جا سکے۔ جب ہماری پارلیمان کا مقصد ہی یہ ہو جو میں نے اوپر عرض کیا ہے تو کیا اس کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ اس میں جا کر قانون سازی کرنے والوں کو منتخب کرنے میں ان لوگوں کا بھی ہاتھ ہو جو سرے سے اس نظریہ حیات کو ماننے والے ہی نہ ہوں جس نظریہ حیات کے اثبات' اور جس کے قیام و استحکام کے لئے یہ ملک حاصل کیا گیا تھا۔ اس کے اہل صرف وہ ہو سکتے ہیں جو اس نظریہ حیات پر ایمان رکھتے ہوں اور اس کا قیام و استحکام جن کی زندگی کا مقصد ہو۔ لہٰذا مخلوط انتخابات کا وہ ڈھکوسلہ جس کا ڈھنڈورا' اس وقت اس زور و شور سے پیٹا جا رہا ہے اور جس کے جواز کے لئے انتہائی بودے دلائل مہیا کئے جا رہے ہیں' درحقیقت اسلامی نظریہ حیات ہی نہیں' نفس اسلام کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکنے کے مترادف ہے۔ میں ان دانشوران قوم سے جو اقلیتوں کو دوہرے ووٹ کا حق دینے اور مخلوط طرز انتخاب کے فیصلے کے جواز میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہے ہیں' یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ کیا محمدؐ کی پارلیمان میں کوئی ایک رکن بھی ایسا تھا جس کا تعلق ان کی اپنی جماعت مومنین سے نہ ہو۔ کیا خلفائے راشدینؓ کے انتخاب کے لئے کسی ایسے شخص کا بھی ووٹ لیا گیا تھا جس کا تعلق ان کی اپنی جماعت مومنین سے نہ ہو۔ غرضیکہ نہ تو حضورؐ کی پارلیمان میں کوئی ابوجہل تھا نہ ہی خلفائے راشدین کے انتخاب میں کسی جے سالک یا رانا چندر سنگھ کا کوئی ہاتھ تھا۔

جب آپ اپنی پارلیمان کے اراکین کے انتخاب کے لئے ووٹ دینے کا حق ان لوگوں کو بھی دے دیں گے جو آپ کے نظریہ زندگی کو تسلیم ہی نہیں کرتے تو ظاہر ہے وہ کسی ایسے شخص کو تو اپنا ووٹ ہرگز نہیں دیں گے جس کا نقطہ نظر' نظریہ پاکستان کا استحکام اور مقاصد پاکستان کا حصول ہو۔ اس طرح ایسے لوگ منتخب ہو کر ایوان ہائے پارلیمان میں

آئیں گے جو اس مملکت کے اسلامی تشخص کو کوئی اہمیت نہ دیتے ہوں اور یوں اس مملکت کو اپنے اسلامی تشخص سے دستبردار ہونے پر آمادہ کیا جا سکے گا۔ اگر ایسا ہو گیا تو یہ نظریہ پاکستان کی بنیاد سے انحراف ہو گا۔

ضمناً" اس سے پہلے بھی اور آج کل پھر حضرت قائداعظمؒ کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کو' ترپ کے پتے کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے اور بالخصوص آج کل اقلیتوں کو دوہرے ووٹ کا حق دینے اور مخلوط انتخاب کو جائز قرار دینے میں اسے بنیاد بنایا جا رہا ہے۔

میں اس تقریر کا پس منظر اور اس کے پیش نظر مقصد پر اپنی طرف سے کچھ کہنے کی بجائے' حضرت قائداعظمؒ کے قریب ترین ساتھی اور تحریک پاکستان کی دینی اساس پر ان کے ذاتی مشیر علامہ غلام احمد پرویز مرحوم کا تجزیہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں جو انہوں نے اپنے اس خطاب میں پیش کیا تھا جسے انہوں نے مرحوم جسٹس محمد منیر کی کتاب From Jinah to Zia میں جسٹس موصوف کے اس الزام کے جواب میں دیا تھا کہ قائداعظم پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے۔

اب آیئے قائداعظمؒ کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کی طرف۔

قائداعظمؒ نے اپنی تقریر میں جملہ اہل پاکستان کو مخاطب کر کے فرمایا:

------ تم آزاد ہو' تمہیں اس امر کی کامل آزادی ہے کہ تم اپنے مندروں میں جاؤ یا مسجدوں میں' یا مملکت پاکستان میں کسی اور پرستش گاہ میں۔ تمہاری ذات یا مسلک کچھ بھی ہو' اس کا امور مملکت سے کچھ تعلق نہیں ہو گا۔

اس کے بعد انہوں نے کہا کہ (اور تو اور) انگلستان کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ وہاں عیسائیوں ہی کے دو فرقوں۔ رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ۔ میں کس قدر کشت و خون ہوا کرتا تھا۔ لیکن اس مملکت نے' اپنی کامل ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے' رفتہ رفتہ ان مناقشات کو مٹا دیا اور "اب تم پورے انصاف سے کہہ سکتے ہو کہ وہاں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ نہیں' بلکہ ایک مملکت کے شہری بستے ہیں"۔ اسی طرح:

میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اپنے سامنے یہ نصب العین رکھنا چاہئے کہ ایک وقت کے بعد یہاں نہ ہندو' ہندو رہے گا' نہ مسلمان' مسلمان---- مذہبی نقطہ نگاہ سے نہیں' کیونکہ وہ تو ہر فرد کے ذاتی عقیدہ کا سوال ہے۔ ایسا' ان سب کے پاکستان کے شہری ہونے کی حیثیت سے' سیاسی نقطہ نگاہ سے ہو گا۔

پرویز صاحب اپنے مذکورہ خطاب میں کہتے ہیں کہ:

یہ ہیں قائداعظمؒ کے وہ الفاظ جنہیں سپر بنا کر یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے تشکیل پاکستان کے فوری بعد دو قومی نظریہ کو بھی خیرباد کہہ دیا تھا اور اسلامی مملکت کے تصور کی تردید کر کے اسے سیکولر بنانے کا اعلان کر دیا تھا۔ اگر قائداعظمؒ کہیں مریخ سے آئے ہوتے اور انہوں نے پہلے پہل یہ الفاظ کہے ہوتے تو اس تقریر سے اس قسم کے استنباط کا شائبہ ہو سکتا تھا۔ لیکن جس شخصیت کی دس سالہ (تحریک پاکستان کی) زندگی اور اس دوران میں اس کے صدہا صفحات پر مشتمل بیانات' تقاریر' خطابات ہمارے سامنے ہوں' اس کی طرف ان نتائج کو منسوب کرنا جس قدر زیادتی

ہے' اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جب ان لوگوں سے اس دلیل کا جواب نہیں بن پڑتا تو وہ (نہایت دیدہ دلیری سے) کہہ دیتے ہیں کہ بے شک قائداعظمؒ دس سال تک یہ دعویٰ کرتے رہے لیکن وہ درحقیقت ایک وکیلانہ حربہ تھا جسے انہوں نے اپنا مقدمہ جیتنے کے لئے اختیار کیا تھا۔ جب کیس کا فیصلہ ان کے حق میں ہو گیا تو اس حربہ کی ضرورت نہ رہی۔ ایسا کہنے والے اتنا بھی نہیں سوچتے کہ وہ یہ کچھ کس شخص کے متعلق کہہ رہے ہیں؟ ہم بربنائے عقیدت نہیں کہتے' بلکہ یہ حقیقت ہے کہ جو شخص قائداعظمؒ کے کیریکٹر کے متعلق کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے' وہ ان کے خلاف اس قسم کا الزام عائد کرنے کی جرأت کبھی نہیں کر سکتا۔ حق گوئی اور بے باکی ان کے کردار کی ایسی خصوصیت تھی' جس کا اعتراف ان کے دشمنوں تک کو تھا۔ لندن ٹائمز نے ان کی وفات پر لکھا تھا:

قائداعظمؒ نے اپنی ذات کو ایک بہترین نمونے کے طور پر پیش کر کے اپنے اس دعویٰ کو ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ان میں وہ لچک نہیں تھی جو انگریزوں کے نزدیک' ہندوستانیوں کا خاصہ ہے۔ ان کے تمام خیالات ہیرے کی طرح قیمتی مگر سخت' واضح اور شفاف ہوتے تھے۔ ان کے دلائل میں ہندو لیڈروں جیسی حیلہ سازی نہیں تھی۔

قائداعظمؒ کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے یہ دیکھنا چاہئے کہ انہوں نے جب مجلس آئین ساز سے خطاب کیا تھا تو ملک کے حالات کیا تھے۔ تقسیم ہند کے ساتھ ہی ہندوستان میں ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا تھا۔ اس سے وہاں کے مسلمانوں کے دل میں خوف و دہشت کے ایسے جذبات ابھرے کہ انہوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پاکستان میں آکر پناہ لے لیں۔ لیکن ان وحشی درندوں نے ان نہتے قافلوں کو بھی نہ چھوڑا۔ راستہ بھر قتل و غارتگری کی وارداتیں ہوتی رہیں۔ ان کی نوجوان لڑکیوں کو ہزاروں کی تعداد میں چھین جھپٹ کر لے گئے۔ ان کے معصوم بچوں کو نیزوں کی انیوں پر اچھالا گیا۔ اور تو اور دلی سے جو گاڑیاں خود حکومت کے عملہ کو لے کر روانہ ہوئیں (میں بھی انہیں میں شامل تھا) یہاں پہنچنے پر ان میں سے زندہ انسانوں کی بجائے لاشوں کے ٹکڑے برآمد ہوئے۔ ظاہر ہے کہ ان وحشیانہ مظالم کا ردعمل پاکستان کے بعض حصوں میں بھی ہوا اور اس سے یہاں کے غیر مسلم باشندوں (بالخصوص ہندوؤں) کے دل میں خوف و ہراس' بے اعتمادی اور بے یقینی کے وساوس پیدا ہوئے۔ آپ سوچئے کہ ایک ایسی مملکت جس کی عمر ابھی ایک دن کی بھی نہ ہوئی ہو اس قسم کے لرزہ خیز حالات سے دوچار ہو۔ پھر اس کی کیفیت یہ ہو کہ اس کے پاس (ابھی) نہ اپنی فوج ہو' نہ اسلحہ' نہ سامان ہو نہ پیسہ' تو اس کے سربراہ کے دل پر اس سے کیا نہ گزرتی ہو گی؟ اس کے ساتھ اسے بھی ذہن میں رکھئے کہ پاکستان کے اندر خود ایسے عناصر موجود تھے جو ایک طرف یہاں کے غیر مسلموں کے دل میں خوف و ہراس پیدا کر رہے تھے' اور دوسری طرف انہیں اشتعال بھی دلا رہے تھے۔ ہندوستان کے اخبارات یہاں کی غیر مسلم اقلیتوں کے خلاف مظالم کی فرضی داستانیں بیان کر کے وہاں کے مسلمانوں کے خلاف انتقام کی آگ کو تیز سے تیز تر کرتے چلے جا رہے تھے۔ اس کے لئے نہایت ضروری تھا کہ یہاں

غیر مسلم اقلیتوں کو پورا پورا یقین دلایا جائے کہ وہ یہاں ہر طرح سے محفوظ رہیں گی اور مذہب کی بنا پر ان سے کوئی ناروا سلوک نہیں کیا جائے گا۔ یہ تھے وہ حالات جن میں قائداعظمؒ کو پاکستان میں پہلی تقریر کرنی پڑی۔ قائداعظمؒ بڑی متوازن شخصیت کے حامل تھے۔ وہ عام طور پر جذبات سے مغلوب نہیں ہوا کرتے تھے۔ لیکن جن حالات سے اس وقت ملک دوچار تھا اور جتنی عظیم ذمہ داریوں کا بوجھ اس مملکت پر آپڑا تھا' اس کے سربراہ کا ان سے متاثر ہو جانا کوئی غیر فطری امر نہیں تھا۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے وہ غیر مسلموں کو یقین دلانا چاہتے تھے کہ انہیں یہاں اسی قسم کی حفاظت ملے گی جیسی مسلمانوں کو۔ انہوں نے اپنی تقریر میں جو کچھ کہا تھا اس سے ان کا مقصد یہی تھا۔ لیکن (ہمیں اعتراف ہے کہ وہ اپنے معمول کے خلاف) شدت جذبات میں الفاظ کے انتخاب میں کماحقہ' احتیاط نہ برت سکے۔ بایں ہمہ' ان الفاظ سے یہ مستنبط کرنا کہ جس نظریہ کی رُو سے انہوں نے دس سال تک ہندو اور انگریز سے جنگ کر کے پاکستان حاصل کیا تھا وہ اسے پہلے ہی دن نذر آتش کر دیں گے' بڑی زیادتی ہے۔ کوئی باہوش انسان اسے باور نہیں کرے گا۔

آیئے ہم لگے ہاتھوں یہ بھی دیکھیں کہ قائداعظمؒ کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کا مفہوم خود غیر مسلم اقلیتیں کیا سمجھتی تھیں۔ کیا انہوں نے یہ سمجھا تھا کہ اس سے قائداعظمؒ مسلموں اور غیر مسلموں کی متحدہ قومیت کا اعلان کر کے سیکولر سٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے' یا یہ کہ اس سے مقصود غیر مسلم اقلیتوں کا تحفظ تھا؟---- مسٹر جوشوا فضل دین ایک مشہور مسیحی لیڈر تھے (ان کا چند سال پہلے ادھر انتقال ہوا ہے) جب صدر ایوب (مرحوم) نے لاء کمیشن کا تقرر کیا تو مسٹر جوشوا نے اس سوال پر بحث کی تھی کہ مجوزہ آئین کی بنیاد کیا ہونی چاہئے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک پمفلٹ شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا۔ Rationale of Pakistans Constitution۔ اس میں انہوں نے پہلے یہ واضح کیا تھا کہ 1940ء کی قرارداد پاکستان کی رُو سے مملکت پاکستان کے دو بنیادی ستون ہیں۔ یعنی-----

1- مملکت پاکستان کی بنیاد مذہب پر ہو گی۔ یہی وہ قدر مشترک ہے جو مشرقی اور مغربی بازوؤں میں وحدت پیدا کرنے کا موجب بن سکتی ہے۔ اور

2- اقلیتوں کے لئے تحفظات۔

اقلیتوں کے لئے تحفظات :-

اس کے بعد مسٹر جوشوا نے کہا تھا کہ مجوزہ آئین کو یہ دونوں شرائط پوری کرنی چاہئیں۔ اس کے بعد انہوں نے قائداعظمؒ کی 11 اگست 1947ء (اور اس کے ساتھ 14 اگست 1947ء) کی تقریر کے اقتباسات دے کر یہ کہا تھا کہ ان کی تعبیر میں انتہا پسندانہ رویہ اختیار کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قائداعظمؒ کا مقصد یہ تھا کہ یہاں نہ ہندو' ہندو رہے نہ مسلمان' مسلمان۔ بلکہ دونوں کے امتزاج سے ایک متحدہ قوم متشکل ہو جس کا لازمی نتیجہ سیکولر انداز حکومت ہو جائے' وہ بڑی غلطی کرتے ہیں۔ مسٹر جوشوا نے ان لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:

یہ کہنا کہ تخلیق پاکستان کے بعد قائداعظمؒ نے---- جو خود اس پاکستان کے خالق تھے---- اپنی پہلی ہی

تقریر میں کوئی ایسی بات کہہ دی ہے جس سے اس بات کا دور کا بھی امکان ہے کہ اس سے پاکستان کی بنیاد ہی منہدم ہو جائے گی' بالکل پاگل پن ہے۔ قائداعظمؒ نے اتنا ہی کہا تھا کہ پاکستان میں بلالحاظ مذہب و ملت ہر ایک کو مساوی حقوق شہریت حاصل ہوں گے۔

اگست 1947ء کے بعد :-

اس کے بعد مجھے صرف اتنا اور کہنا ہے کہ اگر یہ تقریر قائداعظمؒ کی زندگی کی آخری تقریر ہوتی تو پھر بھی اس مغالطہ آفرینی کی گنجائش نکل سکتی تھی کہ وہ جو کچھ دس سال تک کہتے رہے تھے' آخر میں وہ اس سے تائب ہو گئے تھے۔ اس لئے اب سند اُن کی آخری تقریر ہی ہو سکتی ہے۔ حسن اتفاق کہ قائداعظمؒ اس کے بعد بھی ایک سال تک زندہ رہے۔ اور (اگرچہ ان کا یہ تمام عرصہ انتہائی نازک بیماری کے عالم میں گزرا لیکن بایں ہمہ) انہوں نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں پھر اس کی وضاحت کر دی کہ پاکستان کس قسم کی سٹیٹ ہو گی۔ انہوں نے فروری 1948ء میں' اہل امریکہ کے نام جو پیغام براڈ کاسٹ کیا تھا' اس میں انہوں نے کہا تھا کہ :

مملکت پاکستان' جو دس کروڑ مسلمانوں کے حسین نصب العین کا ایک حد تک حصول ہے' 15 اگست 1947ء کو وجود میں آگئی تھی۔ یہ دنیا میں سب سے بڑی اسلامک سٹیٹ اور تمام دنیا کی مملکتوں میں پانچویں درجہ پر ہے۔ (تقاریر بحیثیت گورنر جنرل' ص 63)

قائداعظمؒ نے اسی ماہ (فروری 1948ء میں) آسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے براڈ کاسٹ میں فرمایا تھا :

مغربی پاکستان' مشرقی پاکستان سے تقریباً ایک ہزار میل کے فاصلہ پر ہے اور ان کے درمیان مملکت ہند کا علاقہ حائل ہے۔ بیرون ممالک کے ایک طالب علم کے دل میں جو پہلا سوال ابھرے گا وہ یہ ہو گا کہ (ایسی مملکت کا قیام) کس طرح ممکن ہو گا۔ ایسے دو خطوں میں' جن میں اس قدر بعد ہو' وحدت حکومت کس طرح ممکن ہو گی میں اس سوال کا جواب صرف ایک لفظ میں دوں گا جو یہ ہے :

ایسا' ہمارے ایمان کی رو سے ہو گا۔ ایمان خدا پر' ایمان اپنے آپ پر' ایمان مستقبل پر' لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ ہم سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں وہ ایسے مختصر سے جواب کا پورا پورا مفہوم سمجھ نہ سکیں گے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس اجمال کی تھوڑی سی تفصیل بھی بیان کر دوں۔ اس کے بعد انہوں نے فرمایا :

پاکستان کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ہم محمدؐ رسول اللہ کی تعلیم کے پیرو ہیں۔ ہم اس اسلامی برادری کے ارکان ہیں جن میں حقوق' شرف و احترام اور تکریم ذات کے اعتبار سے تمام افراد برابر ہوتے ہیں۔ بنابریں' ہم میں اخوت اور وحدت کا بڑا گہرا جذبہ ہے۔ ہماری اپنی تاریخ ہے اور اپنی رسوم و روایات۔ ہم اپنے اسالیب فکر' نقطہ نگاہ اور احساس دروں کے مالک ہیں اور یہی ہیں وہ عوامل جو قومیت کی تشکیل کا مدار بنتے ہیں۔ (تقاریر بحیثیت گورنر جنرل۔ ص 58)

اگر ہم مملکت پاکستان کی بنیاد قرآن مجید پر رکھتے اور اس کی تعلیم کو عام کرتے جاتے تو ہو نہیں سکتا تھا کہ مشرقی پاکستان علیحدہ ہو جاتا۔ اس کی بنیادی

وجہ یہ ہے کہ ہم نے قرآن کریم کے رشتے امت واحدہ ہونے کے اصول و نظریہ کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا اور وطن اور نسل کی تفریق کے تصور کو عام ہونے دیا۔ اس کا لازمی نتیجہ تشتت و افتراق تھا۔

"ایمان' ایمان خدا پر' ایمان اپنے آپ پر' ایمان اپنے مستقبل پر" یہ تھی وہ اساس محکم جس پر مملکت پاکستان کی یہ رفیع و عظیم عمارت استوار ہوئی تھی۔ مجھے ایک بار پھر (بصد تاسف) کہنا پڑتا ہے کہ محترم منیر صاحب نے اپنی کتاب میں اس تقریر کا جو اقتباس دیا ہے (ص 31) اس میں وہ حصہ نقل نہیں کیا جس میں ایمان کا ذکر ہے۔ قائداعظمؒ نے 7 اپریل 1948ء کو گورنمنٹ ہاؤس پشاور میں ایک قبائلی جرگہ کے ساتھ گفتگو کے دوران فرمایا:

ہم مسلمان' ایک خدا' ایک کتاب (قرآن مجید) اور ایک رسولؐ پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس لئے ہمیں ایک قوم کی حیثیت سے صف بستہ کھڑے ہونا ہو گا۔ (تقاریر گورنر جنرل' ص 126)

انہوں نے 14 فروری 1948ء کو سبی دربار میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

میرے پیش نظر ہمیشہ اسلامی ڈیموکریسی کا اصول رہا ہے۔ یہ میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات کا راز ان سنہرے اصولوں کی اتباع میں ہے جنہیں ہمارے مقنن اعظم' حضور نبی کریمؐ نے ہمیں عطا فرمایا ہے۔ لہٰذا' ہمیں اپنی ڈیموکریسی کی بنیاد حقیقی اسلامی نظریات اور اصولوں پر رکھنی چاہئے۔ (تقاریر گورنر جنرل' ص 56)

تقسیم ہند کے عواقب میں' جب انگریز' ہندو اور سکھوں کی سازش نے ہمارے خلاف قیامت برپا کر دی تھی تو قوم شکستہ خاطر سی ہو رہی تھی عین اس حالت میں آپ نے 30 اکتوبر 1947ء کو یونیورسٹی گراؤنڈ لاہور میں تقریر کرتے ہوئے قوم کا حوصلہ بندھایا اور کہا کہ یاد رکھو:

ایسے نامساعد حالات میں بھی اگر ہم نے قرآن مجید سے بصیرت اور راہنمائی حاصل کی تو میں ایک بار پھر یہ کہتا ہوں کہ آخرالامر فتح ہماری ہی ہو گی۔ (تقاریر گورنر جنرل' ص 30)

میں پوچھنا چاہتا ہوں ارباب بصیرت سے کہ سیکولر سٹیٹ کا مدعی کیا اس قسم کے نظریات پیش کرے گا؟ اس موضوع پر کہنے کو تو ابھی بہت کچھ اور بھی کہا جا سکتا ہے اور میں گذشتہ تیس سال سے اس پر لکھتا چلا آرہا ہوں---- لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

(پرویز صاحب کا خطاب "کیا قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟" مطبوعہ جون 1981ء)

آپ نے قائداعظمؒ کی مجولہ تقریر پر پرویزؒ صاحب کا تبصرہ ملاحظہ فرمایا۔ اس میں مسیحیوں کے مشہور لیڈر جوشوا فضل دین کے بیان سے یہ بھی سامنے آگیا کہ اقلیتوں نے اس تقریر سے کیا مفہوم اخذ کیا تھا۔ کیا اس کے بعد بھی حضرت قائداعظمؒ کی اس تقریر سے متعلق کوئی ابہام باقی رہ جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سوال یہ نہیں کہ حضرت قائداعظمؒ کی کس تقریر کا کیا مطلب ہے۔ ان کے اس واضح اور دو ٹوک اعلان کے بعد کہ "اسلامی مملکت قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی کا نام ہے"' سوچنے اور کرنے کی بات یہ ہے کہ وہ کون سے ذرائع اختیار کئے جائیں جن سے مملکت پاکستان کی اس وجہ جواز کو ایک مشہود پیکر میں یہاں وجہ شادابیؒ نظر بنایا جا سکے۔

یاد رکھئے! پاکستان میں قرآن حکیم کی حکمرانی

قائم کرنے کا جو وعدہ ہم نے تحریک حصول پاکستان کے دوران اپنے اللہ سے کیا تھا' اگر ہم نے اسے پورا نہ کیا تو اس سے اللہ کا تو کچھ نقصان نہیں ہو گا۔ البتہ ہم یقیناً برباد ہو جائیں گے۔ کیونکہ اللہ کا قانون مکافات عمل اپنے وعدوں سے پھر جانے والوں کو کبھی معاف نہیں کرتا اور انہیں وہ سزا دیتا ہے جو بعد میں آنے والوں کے لئے عبرت کا تازیانہ ہو۔ ملاحظہ کیجئے۔

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْا اَمْثَالَكُمْ (47/38)

"اگر تم (اپنے وعدوں سے) پھر گئے تو وہ تمہاری جگہ ایک اور قوم لے آئے گا جو پھر تمہارے جیسی (وعدہ شکن) نہیں ہو گی"۔

لہٰذا اپنا یہ وعدہ ہمیں پورا کرنا ہو گا اور اس کے لئے ایوان ہائے پارلیمان میں ایسے نمائندے منتخب کر کے بھیجنا ہوں گے جو اس کے ایفاء کی ذمہ داری سے آگاہ بھی ہوں اور ایسا کر سکنے کے اہل بھی۔ اور ہر اس اقدام سے اجتناب برتنا ہو گا جو اس سلسلہ میں مددگار نہ بننا تو ایک طرف' ہماری سب سے بڑی مشکل بن کر سامنے آجائے اور علیحدہ انتخابات کا اصول ہمیشہ کے لئے اپنانا' اس کی سب سے اہم کڑی ہے۔

یہ ہے جناب جان جوزف اور ان کے ہمنواؤں کی اطلاع کے لئے بانیٔ پاکستان حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ کا موقف جسے روبعمل لانا ہم سب کا مقصد حیات ہے اور اسی میں ہم سب کی بھلائی ہے۔ اس سے الگ ہٹ کر ہر تصور۔ ہر حربہ اور ہر کاروائی خواہ وہ کتنی ہی معصومیت سے کی جائے اس کشتی کے پیندے میں سوراخ کرنے کے مترادف ہے۔

رابطہ

مفکر قرآن علامہ غلام احمد پرویزؒ کی تصانیف' درس قرآن (آڈیو_ ویڈیو کیسٹس) کے حصول اور ترسیل زر کے لئے ایڈریس نوٹ فرما لیجئے۔

ایڈریس :-

طلوع اسلام ٹرسٹ
25 بی گلبرگ 2' لاہور- 54660
فون : 5764484
فیکس : 92-42-876219

بنک اکاؤنٹ :-

حبیب بنک لمیٹڈ
مین مارکیٹ گلبرگ برانچ' لاہور
کرنٹ اکاؤنٹ نمبر 4107-35

طلوع اسلام ٹرسٹ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علی محمد چدھڑ (گوجرانوالہ)

دو قومی نظریہ اور پاکستان پر ہندو ثقافت کی یلغار

(مضمون قدرے دیرے شائع ہو رہا ہے لیکن ہے اب بھی اہم ترین- مدیر)

9 مارچ 1996ء کے روزنامہ 'پاکستان' کے پہلے صفحہ پر ہندوستان کے سابقہ وزیراعظم راجیو گاندھی کی بیوہ سونیا گاندھی کا ایک بیان شائع ہوا ہے- جو بیان کی حد تک تو ایک اخباری بیان ہے لیکن اہم اتنا کہ اس کا ایک ایک لفظ ہمیں غور و فکر کی دعوت دے رہا ہے- اقتباس ملاحظہ فرمائیں-

"ہم نے پاکستان میں اپنی ثقافت متعارف کروا کر ایک ایسی جنگ جیتی ہے- جو ہتھیاروں سے جیتنا ناممکن تھی- اب کی بار ہم نے پاکستان پر ایک ثقافتی یلغار کی ہے- جس نے پاکستان کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا ہے- گزشتہ روز "جدید جنگ اور ہم" کے موضوع پر خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ جدید جنگوں کی حکمت عملی میں بھی تبدیلی آگئی ہے- اب سرحدوں پر لڑائی نہیں لڑی جاتی بلکہ اب نظریاتی جنگوں کا دور ہے- برصغیر پاک و ہند کو چند مذہبی جنونیوں نے اپنے مقاصد کیلئے دو حصوں میں تقسیم کیا تھا اور اسلام کے نام پر حاصل کیا تھا- مگر آج حقائق گواہ ہیں کہ ہم نے اس اسلامی ملک میں اپنی ثقافت متعارف کروا کر دو قومی نظریہ کو پاش پاش کر دیا ہے- آج پاکستان کا بچہ بچہ ہندوستانی ثقافت کا دلدادہ ہے اور تو اور اب پاکستانی ٹی- وی بھی ہمارے مذہبی رقص بڑے فخر سے دکھا کر ہمارا کام آسان کر رہا ہے- اب ہمیں پاکستان کو ہتھیاروں سے نشانہ نہیں بنانا پڑے گا اور مجھے یقین ہے کہ کچھ عرصہ بعد ایک دھکے سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے گا"-

سونیا گاندھی گو ایک غیر ملکی یوروپین خاتون ہیں- لیکن اس کی باتیں نہایت مدبرانہ اور قومی سوچ کی حامل ہیں- معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستانی قومیت (وطنیت) میں اس حد تک رچ بس گئی ہیں کہ اس نے دو قومی نظریہ (اساس پاکستان) کو اپنے دل کا کانٹا بنا لیا ہے- وہ آج بھی مہاتما گاندھی- پنڈت جواہر لال نہرو اور اندرا گاندھی کی زبان سے بات کر رہی ہیں- مثلاً سقوط ڈھاکہ کے بعد مسز اندرا گاندھی نے اپنی فتح کا جشن مناتے ہوئے کہا تھا کہ "یہ کامیابی نہ ہماری فوجوں کی کامیابی ہے اور نہ ہماری حکومت کی یہ ناکامی ہے- اس نظریہ کی جو باطل پر مبنی تھا اور جس پر مسلمانوں نے تحریک پاکستان کی بنیاد رکھی تھی-"

ایک محاورہ ہے کہ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے- سونیا گاندھی نے اپنے خطاب میں وہ حقائق بیان کر دیئے ہیں جنہیں جھٹلانا آسان نہیں- وہ موجودہ دور کو نظریات کے دور سے موسوم کرتی ہیں اور بتانا یہ چاہ رہی ہیں کہ نظریاتی سرحدوں کے مقابلہ میں جغرافیائی حدیں بے معنی اور ریت کی دیوار ثابت ہوتی ہیں- وہ یہ خیال کرنے میں بھی حق

بجانب ہے کہ نظریاتی کش مکش کو حربی جنگوں پر فوقیت حاصل ہے۔ برصغیر پاک و ہند کی تقسیم اس کے دل کا روگ ہے جسے وہ اسلام کے نام پر چند مذہبی جنونیوں کی کارستانی سمجھ کر غلط اقدام کا نام دے رہی ہے۔ اس کے خیال میں متحدہ قومیت کی بنیاد پر ہندو ثقافت پاکستان پر حاوی ہو چکی ہے اور اسی فوقیت کی بناء پر وہ دو قومی نظریہ (اساس پاکستان) کو باطل قرار دے رہی ہے۔

سونیا گاندھی کا بیان صاف ہے۔ کوئی کنفیوژن نہیں۔ ہمیں اس کی داد دینا چاہئے کہ جو کچھ اس کے دل و دماغ میں تھا بغیر کسی لگی لپٹی کے اس نے اگل دیا ہے۔ اسے پورا یقین ہے کہ کچھ عرصہ بعد پاکستان ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر ختم ہو جائے گا اور یہ دعویٰ محض نظری نہیں۔ اس نے بتا دیا ہے کہ اب پاکستان ٹی وی بھی ہندو مذہب کے رقص دکھا کر کام آسان کر رہا ہے۔ بیشک اس سے انکار ممکن نہیں یہ ڈش انٹینا کا دور ہے اور ورلڈ کرکٹ کپ کے سلسلہ میں دن رات جو ثقافتی شو دکھائے جا رہے ہیں۔ ان کے بول اور ایکشن اتنے شرمناک ہیں کہ احاطہ تحریر میں لانا آسان نہیں۔ انڈیا سے شکست کھا کر ورلڈ کپ سے ہماری ٹیم باہر ہو چکی ہے۔ اس کے صدمہ سے متعدد افراد موت کے منہ میں چلے گئے ہیں۔ لیکن ثقافتی پروگرام برابر جاری ہیں اور قوم کے نونہال لڑکے اور لڑکیاں اتنے فحش اور لچر انداز سے محو دھمال ہوتے ہیں۔ جیسے غیرت کا لبادہ گھر بھول آئے ہوں۔

ہندو ایک مکار دشمن ہے جس کے سیاسی مہاتما چانکیہ کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ ہمسایہ سلطنتوں سے ہمیشہ دشمنوں جیسا سلوک رکھو اور قیام امن کا خیال تک بھی دل میں نہ لاؤ خواہ ساری دنیا تمہیں اس پر مجبور کیوں نہ کرے۔ اسی سوسائٹی کا ایک نمائندہ مہاتما گاندھی بھی ہے۔ جس کے متعلق قائداعظمؒ نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ "گاندھی کا مقصد وہ نہیں ہوتا جو وہ زبان سے کہتے ہیں اور جو ان کا درحقیقت مقصد ہوتا ہے۔ اسے کبھی زبان پر نہیں لاتے" (تقاریر جلد اول ص 488) تحریک پاکستان کے دوران ہندو راہنما بظاہر سیکولر سیاست کے مدعی تھے لیکن ان کی ذہنیت اتنی منافقانہ تھی کہ وہ جہاں ایک طرف اسلام کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے وہاں درپردہ ہندوستان کو ہندو سٹیٹ بنانے میں شب روز مصروف کار تھے۔ مسٹر ساورکر اس زمانے کے ایک جانے پہچانے ہندو راہنما تھے وہ کہا کرتے تھے کہ "لفظ ہندی سے عبارت ہے ہر وہ شے جو ہندوستان کی ہو مثلاً کلچر۔ نسل اور روایات وغیرہ اور ہندو کے معنی ہیں ہر وہ شخص جو ہندوستان کا رہنے والا ہو" (سٹیٹس مین 30 فروری 1949ء)

مارچ 1940ء سے قبل تک مسلم لیگ نے حصول پاکستان کیلئے کوئی باقاعدہ قرارداد یا ریزولیوشن پاس نہیں کیا تھا اور مہاتما گاندھی اور اس کے ہمنوا بھی غالباً" پاکستان کی مخالفت میں کوئی خاص سرگرم نہ تھے۔ لیکن جب مارچ 1940ء میں حصول پاکستان کا ریزولیوشن پاس ہو گیا۔ تو مہاتما گاندھی کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور وہ کھل کر سامنے آگئے۔ چنانچہ 17 اپریل 1940ء کو ان کے دل کا زہر زبان پر آگیا۔ بڑے جذباتی اور ترش لہجے میں فرمایا کہ "میں پوری جرات و جسارت کیساتھ اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ مسٹر جناح اور ان کے ہم خیال حضرات اپنی روش سے اسلام کی کوئی خاص خدمت سرانجام نہیں

دے رہے بلکہ وہ اس پیغام کی غلط ترجمانی کر رہے ہیں جو لفظ 'اسلام' کے اندر پوشیدہ ہے---- میں اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کروں گا اگر میں ہندوستان کے مسلمانوں کو اس دروغ بافی سے متنبہ نہ کروں جس کا اس نازک وقت میں ان میں پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے۔" اس کے بعد تاریخ شاہد ہے کہ مہاتما گاندھی سمیت تمام ہندوؤں اور نیشنلسٹ مسلمانوں نے پورے سات سال تک مطالبہ پاکستان کی مخالفت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ لیکن ان کی مسلسل مخالفت کے علی الرغم پاکستان حاصل ہو گیا تو پھر انہوں نے ایک دوسرا پینترا بدلا۔ ڈاکٹر شیام پرشاد مکر جی نے یہ اعلان کر دیا کہ "ہمارا نصب العین یہ ہونا چاہئے کہ پاکستان کو پھر سے ہندوستان کا حصہ بنا لیا جائے۔ اس حقیقت کے متعلق میرے دل میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ ایسا ہو کر رہے گا۔ خواہ یہ معاشی دباؤ سے ہو۔ سیاسی دباؤ سے یا اس کے لئے دیگر ذرائع استعمال کرنے پڑیں" (آرگنائزر 47-7-3)۔

اور تو اور جب تقسیم ہند کا بل منظوری کیلئے برطانوی پارلیمان میں پیش ہوا۔ تو برطانیہ کے وزیراعظم لارڈ ایٹلی (جو اس وقت میجر ایٹلی تھے) اپنی تقریر میں فرما رہے تھے کہ "ہندوستان تقسیم ہو رہا ہے۔ لیکن مجھے امید واثق ہے کہ یہ تقسیم زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکے گی اور یہ دونوں مملکتیں جنہیں ہم اس وقت الگ کر رہے ہیں ایک دن پھر آپس میں مل کر رہیں گی"۔

کانگریس کی طرف سے تقسیم ہند کے فیصلہ پر دستخط پنڈت جواہر لال نہرو نے کئے تھے۔ وہ ایک طرف اس فیصلہ پر دستخط کر رہے تھے اور دوسری طرف اپنی قوم سے کہہ رہے تھے کہ "ہماری سکیم یہ ہے کہ اس وقت جناح کو پاکستان بنا لینے دیں اور اس کے بعد معاشی طور پر یا دیگر انداز سے ایسے حالات پیدا کرتے جائیں جن سے مجبور ہو کر مسلمان گھٹنوں کے بل جھک کر ہم سے درخواست کریں کہ ہمیں پھر سے ہندوستان میں مدغم کر لیجئے"۔ (پاکستان فیسز انڈیا ص 99)

سونیا گاندھی کے مذکورہ بیان کا اگر اس سارے سیاق سباق اور پس منظر میں تجزیہ کیا جائے تو نتیجہ یہی ہے کہ یہ ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ جنہیں بہرصورت (ہندوؤں کے نقطہ نظر سے) پاکستان کے ادغام پر ختم ہونا ہے۔ اس کے لئے خواہ ثقافتی میزائل چھوڑے جائیں یا ایٹمی اسلحہ سے کام لیا جائے بات ایک ہی ہے۔ حربی جنگوں کی ناکام کوشش پہلے ہو چکی ہے۔ اب تعلیمی۔ مذہبی اور سماجی ثقافتیں آزمائی جا رہی ہیں۔ صدر اول میں مجوسی اور نصاریٰ کی سپر طاقتیں جب اسلامی لشکروں کے مقابل نہ ٹھہر سکیں تو انہوں نے بھی مسلم ممالک میں اسلامی اقدار کی جگہ عجمی ثقافت متعارف کرائی تھی۔ جس کا خمیازہ آج تک امت مسلمہ بھگت رہی ہے۔ ہمارے اکثر خوش فہم رہنما یہ کہتے ہوئے نہیں تھکتے کہ پاکستان خدا کے فضل سے قائم رہنے کیلئے بنا ہے۔ یہ اسلام کا قلعہ ہے اور دنیا کی کوئی طاقت اسے گزند نہیں پہنچا سکتی۔ بات کسی حد تک درست ہے۔ ایسا کہنے والے یقیناً یہی سمجھتے ہیں لیکن شائد وہ نہیں جانتے کہ مسلمان اپنے نظریات و اقدار کے سہارے یورپ کے ملک سپین پر چھ سو سال تک حکمران رہے۔ لیکن اپنے اس معیار کو نظر انداز کر دیا تو عیسائیت کی حربی اور ثقافتی یلغار کی تاب نہ لا سکے۔ آج وہاں ان کی قبروں کے نشان بھی باقی نہیں ہیں۔

ہندو ایک سرمایہ دار قوم ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ اپنی ثقافتی یلغار کیلئے ہمارے ٹی وی میڈیا پر ہی انحصار کرے۔ اس کے لئے دیگر ذرائع مثلاً اخبارات و رسائل، ریڈیو اور نام نہاد ثقافتی شو بھی استعمال ہو سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہم سب جانتے ہیں کہ برصغیر کے مذہبی علماء کی اکثریت نے بھی پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ ایسی سیاسی پارٹیوں کی بھی کمی نہیں جو آج بھی متحدہ قومیت پر یقین رکھتی ہیں۔ لہٰذا اس قسم کی سیاسی اور مذہبی لابی ہندو مقاصد کیلئے استعمال ہو سکتی ہے ادبی اور صحافتی میدان اس مقصد کیلئے اور بھی زیادہ وسیع ہے۔ ایک اچھا خاصا ترقی پسند گروہ سونیا گاندھی کے مقاصد کی تکمیل کیلئے حاضر سروٹ کے طور پر کام کر سکتا ہے۔ عموماً ہوتا یہ ہے کہ مذہبی۔ سیاسی اور ادبی طبقہ کے لوگ اپنے معمول کے فرائض کے سلسلہ میں وفود کی شکل میں خیر سگالی کے طور پر ایک دوسرے کے ممالک میں جاتے آتے رہتے ہیں۔ بظاہر یہ لوگ قومی و ملکی سفیر کے طور پر کام کرتے ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ عوام کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ کہ ملک کی تقسیم فرقہ وارانہ طور پر غیر قدرتی تھی اور قائداعظمؒ کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہو گئی تھی جس کی قطعاً کوئی ضرورت نہ تھی۔

ممکن ہے مملکت خداداد کے وجود کو ختم کرنے کے عزائم کو سونیا گاندھی کی بڑ یا لاف زنی خیال کیا جائے۔ لیکن یہ محض خوش فہمی ہے اور اپنی ذمہ داریوں سے فرار کی راہ۔ پاکستان کے ہاتھوں رن کچھ میں شکست کھانے کے بعد ہندو رہنماؤں نے اعلان کیا تھا کہ پاکستان کے خلاف اب ہم اپنی مرضی کا محاذ کھولیں گے اور کچھ ہی دیر بعد 1965ء میں لاہور پر حملہ کر کے انہوں نے اپنے الفاظ کو عملی جامہ پہنا دیا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سونیا کے بیان کو ایک صنف نازک کی بات سمجھ کر نہ ٹال دیا جائے بلکہ اسے سارے ہندوستان کی آواز سمجھ کر ابھی سے اس کے تدارک کی تدابیر کی جائیں جیسا کہ مذکورہ بیان سے ظاہر ہے۔ مسز اندرا گاندھی کی بہو خود اپنے الفاظ میں کہتی یہ ہے کہ "ہم نے اس اسلامی ملک میں اپنی ثقافت متعارف کروا کر دو قومی نظریہ کو پاش پاش کر دیا ہے۔" دیکھنا یہ ہے۔ کہ اگر کسی حق بات کو دنیا تسلیم نہ کرے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس کی حقیقت ختم ہو گئی ہے۔ حق سے انکار کر کے ہم اسے باطل قرار نہیں دے سکتے۔ حق ہمیشہ حق ہی رہتا ہے۔ دو قومی نظریہ ایک حقیقت اور دین کے اصل الاصول کے طور قرآن کریم میں موجود ہے۔ جہاں فرمایا کہ "وہی ہے جس نے تم سب کو پیدا کیا پھر کوئی تم میں سے کافر ہے اور کوئی مومن" (64/2)۔ گویا قرآن کریم میں بیان کردہ تفریق انسانیت کے مطابق دنیا میں دو ہی قومیں بستی ہیں۔ مومن اور کافر۔ ہمارے مخالفین کا یہ کہنا غلط ہے کہ دو قومی نظریہ علامہ اقبالؒ یا قائداعظمؒ نے تحریک پاکستان کے دوران وضع کیا تھا اور نہ ہی یہ کسی ہنگامی یا سیاسی مصلحت کی پیداوار ہے۔ پس دو قومی نظریہ اب بھی قائم ہے اور دنیا کی کوئی طاقت اپنی ثقافت یا دیگر کسی مذموم حربے سے اسے گزند نہیں پہنچا سکتی۔ البتہ یہ تسلیم کہ ہندو ثقافت نے وقتی طور پر اس نظریہ سے مسلمانوں کو غافل ضرور کر دیا ہے۔ لیکن جونہی اس پر عمل ہوا۔ سونیا کی ثقافت دھری کی دھری رہ جائے گی۔ بعینہ جس طرح تحریک پاکستان کے دوران دو قومی نظریہ پر عمل ہوا تو انڈیا کی تینوں

طاقتوں (انگریز۔ ہندو۔ نیشنلسٹ مسلمان) کی انتہائی مخالفت کے باوجود پاکستان قائم ہو گیا تھا۔ باقی ہم یہ بھی تسلیم نہیں کرتے کہ بقول مسز اندرا گاندھی سقوط ڈھاکہ کے بعد دوقومی نظریہ سمندر میں غرق ہو گیا تھا۔ اگر وہ اپنے وطنی معیار قومیت پر اتنی ہی نازاں تھی تو مغربی اور مشرقی بنگال کو دوبارہ متحد کر کے انڈیا کا حصہ کیوں نہ بنا لیا۔ آخر وہ کونسا نظریہ تھا۔ جس نے اندرا گاندھی کے مفتوحہ علاقہ کو آج بھی ایک خود مختار اسلامی ملک (بنگلہ دیش) کی حیثیت سے قائم و دائم رکھا ہوا ہے۔

خیر یہ تو اغیار کی باتیں ہیں جو دوقومی نظریہ کو باطل خیال کرتے ہیں۔ ہم ان کے متعلق کیا خیال کریں جو بظاہر اس کے علمبردار ہیں لیکن درحقیقت وہ بھی اس نظریئے کے بنیادی اصول کو تسلیم نہیں کرتے۔ مثلاً اسلام میں معیار قومیت وطن کا اشتراک نہیں۔ دین کا اشتراک ہے۔ دوقومی نظریہ کے مدعی کہتے ہیں۔ پاکستان میں بسنے والے مسلم اور غیر مسلم ایک قوم ہیں۔ اس لحاظ سے دونوں گروہوں میں کوئی فرق نہیں۔ آپ اپنے اپوزیشن لیڈر جو دن رات دوقومی نظریہ کے اصلی محافظ بنے پھرتے ہیں سے پوچھ کر دیکھ لیں کہ آپ جن دو قوموں کے مدعی ہیں فرمایئے کہ پاکستان میں وہ قومیں کون کون سی ہیں۔ یقیناً ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہ ہو گا۔

یہی حال مقتدر حضرات کا ہے۔ اپنے قومی نظریات کے متعلق وہ بھی اپوزیشن جیسے خیالات رکھتے ہیں۔ ہماری وزیراعظم اپنی تقاریر میں اکثر اپنے اس وعدے کو دہراتی رہتی ہیں کہ ہم پاکستان کو علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کا پاکستان بنا کر ہی دم لیں گے۔ لیکن انہوں نے کبھی اس کی وضاحت نہیں کی کہ ملت کے ان عظیم محسنوں کے تصور کا پاکستان کیا تھا۔ یہ نہیں کہ وہ اس حقیقت سے بے خبر ہیں۔ وہ اچھی طرح سے جانتی ہیں کہ قائداعظمؒ کس صورت میں بھی ملک میں تھیاکریسی رائج کرنے کے حق میں نہ تھے اور یہ بھی کہ اس کی جگہ وہ قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی قائم کرنا چاہتے تھے۔ غور کا مقام ہے کہ پھر وہ کونسی مصلحت ہے جس پر بابائے قوم کی تمام تمناؤں کو قربان کر دیا گیا۔ دراصل یہی وہ مشکل مقام ہے جہاں بڑے بڑے جبرائیلوں کے بھی پر جل جاتے ہیں۔ یہی وہ گھاٹی ہے جہاں جاگیرداری اور سرمایہ داری کو پسینہ آجاتا ہے۔ اسی دار احتساب پر جب بڑے بڑے شہنشاہوں کو موت نظر آنے لگتی ہے تو پھر وہ قرآنی اصول و احکام سے فرار اختیار کر کے تھیاکریسی کے اسلام میں پناہ ڈھونڈ لیتے ہیں اور آخر تک اسی کوشش میں رہتے ہیں کہ : ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبر کہیں--- افسوس کہ جب ہم نے مسلمان کہلانے کے ناطے سے اسی طرح قرآن سے گریز کی راہیں تلاش کیں تو اقوام عالم میں ہمارے لئے کوئی جگہ نہ رہی۔ بقول میر تقی میرؔ

بیٹھنے کون دے ہے پھر اسکو
جو ترے آستاں سے اٹھتا ہے

دو قومی نظریہ ہماری مملکت کی اساس ہے۔ اپنی بے ہودہ اور شرمناک ثقافت کے ذریعہ اس اسلامی ریاست کو ختم کرنا ہندو قوم کے منشور میں شامل ہے۔ سونیا گاندھی کے بیان کے پیش نظر ہمارے لئے لمحہ فکریہ یہ ہے کہ دوقومی نظریہ کی آبی اور عملی طور پر نفی کر کے آج ہم اسی درخت کو خود ہی کاٹ رہے ہیں۔ جس کے پھل۔ پھول اور سایہ سے پورے انچاس سال تک مستفید ہوتے رہے ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ اگر وطنیت کو معیار قومیت قرار دے لیا گیا تو اس کا نتیجہ لادینی ہو گا اور قائداعظمؒ نے فرمایا تھا کہ اگر ہم نے دو قومی نظریہ کی بنا پر پاکستان حاصل نہ کیا تو برصغیر میں نہ مسلمان باقی رہیں گے نہ اسلام۔ درحقیقت آج ہم نے وطنیت کو معیار قومیت قرار دیکر پاکستان کی وجہ جواز کی خود ہی نفی کر دی ہے۔ اگر اس کی بروقت تلافی نہ کی گئی۔ تو اول تو یہ مملکت ہی باقی نہ رہ سکے گی اور اگر یہ باقی بھی رہی تو یہ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا گہوارہ نہ بن سکے گی۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

کراچی صدر اور حیدر آباد (قاسم آباد) سندھ میں

سلسلہ وار درس قرآن کریم کا اہتمام (بذریعہ ویڈیو کیسٹ) مندرجہ ذیل مقامات پر کیا گیا ہے۔

شہر	مقام	دن	وقت
کراچی صدر	فاروق ہوٹل ہال۔ زیب النساء سٹریٹ بالمقابل فٹ رائٹ شوز شاپ	جمعتہ المبارک	10 بجے صبح
حیدر آباد	12-B حیدر آباد ٹاؤن فیز 2 بالمقابل قسیم نگر قاسم آباد	جمعتہ المبارک بعد نماز عصر	

دعوت عام ہے تشریف لائیں

قرآنی لٹریچر۔ جملہ مطبوعات طلوع اسلام ٹرسٹ، مجلّہ طلوع اسلام کے تازہ شمارے درس کے دوران 35% رعایت کے ساتھ حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

رابطہ :

ایاز حسین انصاری نمائندہ بزم طلوع اسلام کراچی صدر، بزم طلوع اسلام قاسم آباد حیدر آباد (سندھ)

ٹیلی فون : کراچی 4571919 حیدر آباد 654906

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حقائق و عبر

دروغ گوئی کی بھی حد ہوتی ہے

روزنامہ پاکستان کی 19 مارچ 96ء کی اشاعت میں "سائنس اور سرمائے کی تہذیب کے تاریخی تناظر" کے عنوان کے تحت---------- جناب مسعود احمد قریشی صاحب کا تبصرہ شائع ہوا ہے جس میں موصوف نے خود اپنی ہی وضاحت کے خلاف علامہ غلام احمد پرویز مرحوم پر الزام عائد کیا ہے کہ علامہ پرویزؒ کے نزدیک "سیکولرازم کا دوسرا نام اسلام ہے" حالانکہ علامہ پرویزؒ اپنی ساری عمر یہی جنگ لڑتے رہے کہ اسلام ایک دین ہے جو دنیا و آخرت دونوں زندگیوں پر محیط ہے۔ اس میں سیکولرازم کے لئے کسی قسم کی کوئی گنجائش نہیں۔ علامہ مرحوم کی جس کتاب کا حوالہ محترم مضمون نگار نے دیا ہے اور اس کتاب سے جو اقتباس انہوں نے پیش کیا ہے اس سے کسی جہت سے بھی یہ بات مترشح نہیں ہوتی کہ علامہ موصوف نے زندگی میں کبھی ایسا کہا ہو۔

فاضل مضمون نگار یا تو "سیکولرازم" کا مطلب نہیں سمجھتے یا اپنی گفتگو کا آغاز گالی سے کرنے کے عادی ہیں۔ پرویزؒ صاحب کی کتاب "اسباب زوال امت" جس کا حوالہ انہوں نے دیا ہے' میں پرویزؒ صاحب کے یہ الفاظ بھی یقیناً ان کی نظر سے گذرے ہونگے :-

"اس وقت ساری دنیا غیر خداوندی نظامہائے زندگی کے عذاب میں مبتلا ہے۔ اس میں مغرب کی وہ قومیں بھی شامل ہیں جو خدا کو مانتی ہیں' لیکن ان کا نظام سیکولرازم ہے (مثلاً مغرب کی جمہوریتیں) اور وہ قومیں بھی جنہوں نے یکسر خدا کی ہستی سے انکار کر دیا ہے (مثلاً کمیونزم کی علمبردار حکومتیں)۔ انہیں اس جہنم سے نکلنے کا راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ قرآنی نظام میں یہ قوت ہے کہ وہ انسانیت کو اس جہنم سے نکال کر' جنت ارضی (اور اس کے بعد جنت اخروی) کی طرف لے جائے۔ اگر ہم نے اس نظام کے قیام کی ابتدا کر دی' تو ہم خود بھی موجودہ جہنم سے نکل سکیں گے اور باقی دنیا کو بھی جنت کا راستہ دکھا سکیں گے اور اگر ہم نے یہ راستہ اختیار نہ کیا' تو خود بھی تباہ ہو جائیں گے اور دیگر اقوام کی تباہی کا بھی موجب بنیں گے۔ (اسباب زوال امت۔ ایڈیشن ہشتم 1993ء_ ص 119-120)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقد و نظر

مجلس اقبال

(مستقبل قریب میں شائع ہونے والی پرویزؒ صاحب کی نئی کتاب شرح اسرار و رموز کا تعارف)

مثنوی "اسرار خودی و رموز بیخودی" علامہ محمد اقبال مدظلہ العالی کی پہلی مطبوعہ تصنیف ہے۔ اس کی طباعت پر اس کا ایک نسخہ حضرت علامہ نے' اپنے دستخطوں سے' پرویزؒ صاحب کے دادا جان' حکیم' چوہدری رحیم بخش صاحب کو ارسال فرمایا تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان ہر دو بزرگوں کے' اس سے پہلے کے مراسم تھے۔

اس مثنوی میں' علامہ اقبال نے' مسلک وحدت الوجود پر بالعموم اور حافظ پر بالخصوص' کڑی تنقید کی تھی۔ اس سے اہل تصوف کی طرف سے ان کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دیا گیا۔ پرویزؒ صاحب کے دادا جان' خود بھی وحدت الوجودی اور حافظ کے مداح تھے۔ اس اعتبار سے انہیں' ان لوگوں کا ساتھ دینا چاہئے تھا جو علامہ اقبالؒ کے خلاف ہنگامہ کر رہے تھے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا' بلکہ اپنی وسعت قلبی کا ثبوت یوں دیا کہ انہوں نے یہ مثنوی خود' سبقاً سبقاً پرویزؒ صاحب کو پڑھائی۔ اس درس و تدریس کے لئے انہوں نے جو انداز اختیار کیا' اس سے بقول پرویزؒ صاحب "حضرت علامہ کی علمی عظمت اور احترام میرے دل کی گہرائیوں میں اتر گئے"۔ علامہ اقبالؒ سے پرویز صاحب کا یہ پہلا قلبی تعارف تھا۔ اس وقت پرویزؒ صاحب کی عمر 17/18 سال تھی۔

اس کے بعد 1921ء میں پرویزؒ صاحب جب لاہور آئے تو ان کے دادا جان نے' انہیں لاہور میں دو بزرگوں سے ملنے کی تاکید فرمائی۔ ایک امام الدین نجار' جو نواں کوٹ میں رہتے تھے اور جن کے متعلق اس زمانے میں کہا جاتا تھا کہ وہ لاہور کے قطب ہیں اور دوسرے علامہ اقبالؒ۔ پرویزؒ صاحب کہتے ہیں کہ وہ اول الذکر بزرگوار سے تو ایک آدھ مرتبہ ہی ملے لیکن حضرت علامہؒ کے ہاں جو ایک دفعہ گئے تو :

بیا مجلس اقبال و یک دو ساغر کش

کے مصداق' ان کے تبحر علمی سے فیض یاب ہونے کے لئے بار بار ان کی محفل میں گئے۔ ان ملاقاتوں سے پرویزؒ صاحب کے دل میں یہ احساس شدت سے ابھرا کہ دادا جان نے ان کا رخ دانش کدۂ اقبال کی طرف موڑ کر ان پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ انہی محفلوں میں پرویزؒ صاحب نے یہ حقیقت جانی کہ :

منزل و مقصود قرآں دیگر است
رسم و آئین مسلماں دیگر است

پرویزؒ صاحب کہتے ہیں کہ فیضان اقبالؒ سے ہی ان کی سمجھ میں یہ اہم نکتہ بھی آیا کہ قرآن کریم کو عربی زبان اور تصریف آیات کی رو سے سمجھنا چاہئے اور

کسی خارجی عنصر کو اس پر اثر انداز نہیں ہونے دینا چاہئے۔ [2]

پرویزؒ صاحب نے ایک نجی نشست میں راقم الحروف کو بتایا کہ ان ملاقاتوں کے ابتدائی دور میں ایک دن' حضرت علامہ نے ان سے استفسار کیا کہ پرویز تم ہمارے شعروں پر ہی سر دھنتے ہو یا تمہیں خود بھی کچھ ذوق سخن ہے۔ انہوں نے جواباً عرض کیا کہ ہاں میں بھی شعر کہتا رہا ہوں۔ اس پر علامہ صاحب نے ان سے اپنے کچھ اشعار سنانے کی فرمائش کی۔ پرویز صاحب نے کہا کہ جب سے آپ کا کلام سامنے آیا ہے' میرے اپنے شعر پھیکے پڑ گئے تھے' اس لئے میں نے بیاض پھاڑ کر پھینک دی ہے۔ اس پر علامہ اقبال نے فرمایا کہ اگر یہ بات ہے تو پھر تمہاری زندگی میں ایک دن ایسا بھی آئے گا جب تمہارے نزدیک اقبال کے شعر بھی پھیکے پڑ جائیں گے۔ پرویزؒ صاحب کہتے ہیں "اس کے بعد کچھ اور ملاقاتی آگئے اور ہمارا یہ سلسلہ کلام جاری نہ رہ سکا۔ لیکن حضرت علامہ کی اس بات نے مجھے خاصا پریشان کر دیا۔ یہ بات میرے امکان تخیل سے باہر تھی کہ کبھی اقبال کے اشعار بھی بے رنگ ہو سکتے ہیں"۔ اتفاقاً چند روز تک پرویز صاحب مجلس اقبال میں حاضر نہ ہو سکے اور ان کا یہ اضطراب اور پریشانی بڑھتی رہی۔ چنانچہ ایک شام وہ خاص اہتمام کر کے' محفل جمنے کے عمومی وقت سے ذرا پہلے حاضر خدمت ہوئے اور علامہ صاحب کو یہ بات یاد دلا کر پوچھا کہ کیا ایسا ممکن ہے کہ کبھی اقبال کے شعر بھی پھیکے پڑ جائیں۔ اور اگر یہ ہو سکتا ہے تو ایسا کب ہو گا۔ حضرت علامہ نے جواب دیا کہ ہاں ایسا ہو سکتا ہے اور یہ اس وقت ہو گا جب "قرآن تمہاری سمجھ میں آنا شروع ہو جائے گا"۔ پرویز صاحب نے مجھ سے کہا کہ علامہ اقبال کا یہ انکسار محض تھا ورنہ بعد کے تجربہ نے بتایا کہ کلام اقبال درحقیقت ایک ایسا نادر ذریعہ علم ہے جس سے قرآن فہمی کی راہیں آسان ہو جاتی ہیں۔ اس واقعہ کے بعد یہ ملاقاتیں اور ان کے قلبی تعلقات روز بروز بڑھتے ہی چلے گئے۔ 9 جنوری 1938ء کو' حضرت علامہ کی زندگی میں پہلا یوم اقبالؒ منایا گیا۔ اس تقریب سعید میں شرکت کے لئے احباب دہلی کا جو قافلہ علامہ محمد اسلمؒ جیراجپوری کی قیادت میں لاہور آیا' اس میں پرویزؒ صاحب' شیخ سراج الحقؒ اور جناب اسدؒ ملتانی بھی شامل تھے۔[3] اس پہلے یوم اقبال کی تقریب میں پرویز صاحب نے اپنا فکر انگیز مقالہ بعنوان "اقبال اور قرآن" پیش کیا جو' اب ان کی تصنیف "اقبال اور قرآن" کی جلد اول میں شامل ہے۔

10 جنوری 1938ء کو ان احباب دہلی نے حضرت علامہ سے ان کی رہائش گاہ 'جاوید منزل' واقع میو روڈ لاہور پر ملاقات کی۔ اس ملاقات میں جو روح پرور اور اہم موضوعات زیر بحث آئے' انہیں سید نذیر نیازی نے اپنی کتاب "اقبال کے حضور۔ نشستیں اور گفتگوئیں" میں بڑے دلکش انداز میں تحریر کیا ہے۔ حضرت علامہ سے پرویز صاحب کی یہ آخری ملاقات تھی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد' ملت اسلامیہ کا یہ دانائے راز جو تمام عمر اپنی قوم کو جادۂ قرآن پر اس لئے لانے کی کوششوں میں مصروف رہا کہ ایک دن وہ یہ کہنے کے قابل ہو سکے کہ :

زمین از کوکب تقدیر ما گردوں شود روزے
فروغ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے

21 اپریل 1938ء کو یہ کہتا ہوا اس دنیا سے رخصت ہو گیا کہ :

سرود رفتہ باز آید کہ نہ آید
نسیمے از حجاز آید کہ نہ آید
سرآمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ نہ آید

جن حضرات نے عصر حاضر میں اپنے زمانہ کی علمی سطح اور اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق' قرآنی حقائق سمجھنے کی کوشش کی ہے' ان میں علامہ اقبالؒ کا اسم گرامی بڑی ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے اپنی قرآنی فکر کے نتیجہ کے طور پر' اپنی تمام تر کوششیں قوم کو یہ باور کرانے میں صرف کر دیں کہ تمہارے اسلاف :

معزز تھے زمانے میں مسلماں ہو کر

اور تمہاری حالت یہ ہے کہ :

تم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر

انہوں نے قوم سے بالاستمرار یہ کہا کہ ہماری نکبت و زبوں حالی کا واحد سبب یہ ہے کہ ہم نے اس ضابطہ ہدایت کو پس پشت ڈال رکھا ہے' جسے خالق کائنات نے بنی نوع انسان کی طرف' اپنی حتمی' مکمل اور غیر متبدل ہدایت و رہنمائی کے طور پر' اپنے آخری رسول حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰؐ کی وساطت سے یہ کہہ کر بھیجا تھا کہ :

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝ (10/57-58)

"اے بنی نوع انسان ! تمہارے رب کی طرف سے ایک ایسا ضابطہ ہدایت تمہاری طرف آگیا ہے جس میں ہر اس کشمکش کا علاج ہے جو تمہارے دلوں کو وقف اضطراب رکھتی ہے اور جو' ہر اس قوم کو اسے ضابطہ حیات تسلیم کر لے' کامیابیوں کی راہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور انہیں سامان نشوونما عطا کرتا ہے۔

ان سے کہہ دیجئے کہ اس قسم کے ضابطہ ہدایت کا مل جانا' خدا کے فضل اور رحمت سے ہے (تم اسے کسی قیمت پر حاصل نہیں کر سکتے تھے)۔ لہٰذا تمہیں چاہئے کہ اس کے ملنے پر جشن مسرت مناؤ۔ یہ ہر اس شئے سے بہتر ہے جسے یہ لوگ جمع کرتے رہتے ہیں۔"

وہ عمر بھر اپنی اس پکار کو دہراتے رہے کہ :

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

تمہارے لئے اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار ہے ہی نہیں کہ تم اپنی فردوس گم گشتہ کو بار دگر حاصل کرنے کے لئے قرآن کریم ہی کی بارگاہ عالیہ پر دستک دو۔ انہوں نے قوم سے کہا کہ :

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت' جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد' جہاں دیگر شود

اور آخرلامر اسی ضابطہ خداوندی کے مطابق' نظام زندگی کو دنیا کے کسی ایک خطہ میں مشہود پیکر میں ڈھالنے کے لئے انہوں نے "پاکستان" کا تصور پیش کیا۔ انہوں نے پاکستان کا یہ تصور قوم کے سامنے 1930ء میں الٰہ اباد کے مقام پر ہونے والے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں پیش کیا اور ا۔ گوہر مقصود کے حصول کے لئے' انہوں نے اسلامیانِ ہند کی اس ملی جنگ کی قیادت کے لئے' قائداعظمؒ محمد علی جناح جیسے دیدہ ور اور جرأتوں کے پیکر سالار کا

انتخاب کیا۔ حضرت علامہ کا' ملیہ اسلامیہ ہندیہ پر یہ وہ احسان عظیم ہے' جس کے صدقے میں' ان کا سفینۂ حیات' ایک حسین بط کی طرح تیرتا ہوا ساحلِ مراد پر آلگا۔

حضرت قائداعظم نے جب حصول پاکستان کے لئے اپنی تحریک کا آغاز کیا تو انہیں' خلاف توقع ایک ایسے محاذ پر بھی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا جو ان کے اپنے (سیاسی) دائرہ عمل سے باہر تھا۔ یہ مخالفت تھی ان مسلمان نیشنلسٹ علماء کی طرف سے جو ہندو کانگرس کی وظیفہ خوری میں' اپنی قوم کی تمام تر متاع' ہندو کے ہاتھ بیچ ڈالنے کے درپے تھے۔ قائداعظم نے' تحریک پاکستان کی اس محاذ سے مخالفت کے سدباب کی ذمہ داری جناب غلام احمد پرویز کے سپرد کی۔ میاں بشیر احمد صاحب نے بتایا کہ قائداعظم کے اس انتخاب کے محرک علامہ اقبال تھے۔ آپ نے پرویز صاحب کا نام اپنے مذکورہ باہمی تعلقات اور پرویز صاحب کی فہم قرآن سے متعلق اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر تجویز کیا تھا۔ چنانچہ قائداعظمؒ کی تفویض کردہ اس ذمہ داری کی ادائیگی کے لئے 1938ء میں ماہنامہ طلوع اسلام کا دہلی سے آغاز نو ہوا۔ اس زمانے کی طلوع اسلام کی فائلیں اس پر شاہد ہیں کہ پرویزؒ صاحب نے کس مہارت اور جانفشانی سے مجوزہ مملکت پاکستان کی دینی اہمیت اور اس کے حصول کی ضرورت کو قوم کے سامنے پیش کیا۔ حضرت قائداعظمؒ اور ان کے رفقاء کی کوششوں کو بارگاہ ایزدی سے شرف پذیرائی ملا اور 14 اگست 1947ء کو نئی مملکت پاکستان دنیا کے نقشہ پر ابھری جبکہ مخالفین پاکستان کے حصہ میں روسیاہی' ندامت اور شکست کے سوا اور کچھ نہ آیا۔ پرویزؒ صاحب کی یہ مساعی جمیلہ اب "تحریک پاکستان اور پرویز" نامی کتاب میں یکجا کر دی گئی ہیں۔ مزید برآں پرویزؒ صاحب کی تحریک حصول پاکستان کے سلسلہ میں گراں قدر خدمات کے اعتراف میں انہیں حکومت کی طرف سے "تحریک پاکستان گولڈ میڈل" بھی پیش کیا جا چکا ہے۔ یہ ہے علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ سے پرویزؒ صاحب کے تعلقات اور تحریک پاکستان میں ان کی قومی خدمات کی ایک ہلکی سی جھلک۔

پہلے کہا جا چکا ہے کہ طلوع اسلام کا اجراء' حضرت علامہ اقبالؒ کے ایماء پر قائداعظمؒ کے ارشاد کی تعمیل میں ہوا تھا' اس لئے یہ مجلہ' تحریک پاکستان کی دینی اساس کو اُجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ فکر و پیغام اقبال کی نشرواشاعت کا ذریعہ بھی بنا رہا۔ کلام اقبالؒ کا بیشتر حصہ' قرآن حکیم ہی کی تشریح و تفسیر پر مبنی ہے اور "اقبالؒ اور قرآن" پرویزؒ صاحب کا موضوع خاص رہا ہے۔ اس نسبت سے کلام اقبال کی شرح میں جو مقام پرویزؒ صاحب کو حاصل ہے' وہ شاید ہی کسی اور صاحبِ فکر کو نصیب ہو سکے۔ آپ اپنی زندگی میں کلام و پیغام اقبال کے مستند ترین شارح کی حیثیت سے تسلیم کئے جاتے رہے ہیں۔ پرویزؒ صاحب کے' فکر و پیغام اقبال پر دیگر خصوصی مقالات اب اقبالؒ اور قرآن" کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

1951ء میں' مصر کے نامور دانش ور' صاحب قلم اور کلام اقبال کے شیدائی' ڈاکٹر عبدالوہاب عزام' مملکت مصر کے نئے سفیر کی حیثیت میں پاکستان تشریف لائے۔ اس سے پہلے آپ فرانس میں یہ فرائض ادا کر رہے تھے جہاں انہوں نے اقبال کے "پیام مشرق" کا منظوم عربی ترجمہ کیا تھا۔ قیام فرانس

کے دوران کسی تقریب میں آپ کو کسی نے بتایا کہ اگر آپ کلام اقبال سے کماحقہ استفادہ کرنا چاہتے ہیں تو پاکستان جایئے۔ وہاں آپ کو ایک پاکستانی اقبال شناس' کلام اقبال کی حقیقی روح سے روشناس کرائے گا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب' اس وقت کے فرما نروائے مصر' شاہ فاروق سے اپنی خصوصی درخواست پر پاکستان کے لئے سفارت حاصل کر کے یہاں آئے اور سید عبدالواحد صاحب (سیکرٹری مجلس اقبال) کے توسط سے آپ نے پرویز صاحب سے ملاقات کا اہتمام کیا۔ پرویز صاحب سفارت خانہ مصر گئے تو اپنے ذہن میں ایک عجیب سا تصور لے کر۔ وہ کہتے ہیں کہ "سفارت خانے عجیب دنیا ہوتے ہیں۔ ان میں جھانک کر دیکھئے۔ شان و شوکت' ٹھاٹھ باٹھ' تصنع' تکلف' ظاہر داری اور دیگر بے شمار بظاہر حسین لیکن بباطن خبیث وختران ماڈرن ڈپلومیسی قدم قدم پر نظر آئیں گی۔ یہ تن کی دنیا ہے جو "سود و سودائے مکر و فن" سے معمور ہے' نہ کہ "سوز و مستی جذب و شوق" سے آباد من کی دنیا۔ اس جہان گندم و جو میں ان درویشوں کا ذکر کہاں جن کے قلوب و اذہان میں 'قرآن اور اقبال' نے اقدار کی ایک ایسی دنیا بسا رکھی ہو جس میں اضطراب موج کے ساتھ ساتھ' سکون گہر بھی ہو' بو بدلتے رہنے کے باوجود نہ بدلیں اور جن کی حالت یہ ہو کہ :

ز برون در گذشتم' ز درون خانہ گفتم
سخنے نگفتہ' را چہ قلندرانہ گفتم

بہرحال پرویزؒ صاحب سفارت خانہ مصر گئے' اس حال میں کہ آیا نہیں' لایا گیا ہوں۔ سفیر مصر ڈاکٹر عبدالوہاب عزامؒ سے ملاقات ہوئی اور گفتگو شروع ہوئی۔ چند ہی لمحوں کے بعد پرویزؒ صاحب نے یہ محسوس کیا کہ وہ کاخ نمائندہ شاہی میں نہیں بلکہ کسی حجرۂ درویش میں ہیں۔ وہ درویش خدا مست' نہ شرقی ہے نہ غربی۔ ایک طرف ان کا علم و فضل تھا جو عالمانہ نمائش سے پاک تھا۔ اس میں سراسر طالب علمانہ تجسس تھا۔ دوسری طرف ان کا عشق تھا جس نے انہیں سراپا سوز و گداز بنا رکھا تھا۔ یہ اقبال ہی کا فیض ہو سکتا تھا۔ اب پرویز اور عزام اس دنیا میں تھے جہاں تمام حجابات یک لخت اٹھ جاتے ہیں اور ملنے والے "من تو شدم' تو من شدی" کی حقیقی الف بین قلوبکم کی تصویر بن جاتے ہیں۔ یہ ملاقات مجلس قلندران اقبالؒ کا نقش اول بنی۔

چنانچہ مجلس قلندران اقبال کی تاسیس ہوئی اور سفارت خانہ مصر میں اس کی نشستوں میں ضرب کلیم' بال جبریل' ارمغان حجاز (حصہ اردو)۔ جاوید نامہ' اسرار و رموز' پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق اور بانگ درا لفظاً" لفظاً" پڑھی گئیں اور ان کی تشریح کی گئی۔ سفیر اقبال ڈاکٹر عزامؒ نے ان شرحوں کو منظوم عربی کا پیرہن دیا اور پوری دنیائے عرب کو فکر اقبالؒ کے نور سے منور کر دیا۔ انہوں نے علامہ اقبال کے عرب دنیا میں تعارف کی غرض سے ایک خود مکتفی کتاب بعنوان "محمد اقبال۔ سیرتہ' شعرہ و فلسفتہ' بھی تالیف کی۔

ان مجالس میں ظاہر ہے کہ شیخ قلندراں کا منصب پرویز صاحب ہی کے لئے مختص تھا کیونکہ کلام اقبال وہی پڑھا اور پڑھایا کرتے تھے۔ ضرب کلیم کے عربی ترجمہ کا تعارف بھی ڈاکٹر صاحب موصوف نے پرویز صاحب ہی سے لکھوایا' جو اب پرویز صاحب کی تصنیف "اقبال اور قرآن" جلد اول میں شامل ہے۔

یہ سلسلہ 4 سال تک جاری رہا اور اس مجلس

کی آخری نشست 11 دسمبر 1954ء کو منعقد ہوئی جس میں مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق' کا آخری باب زیر مطالعہ رہا۔ اس کے بعد سفیر اقبال' پاکستان سے رخصت ہو کر سعودی عرب چلے گئے۔

1955ء میں بعض احباب کی طرف سے تقاضے موصول ہونا شروع ہوئے کہ طلوع اسلام میں پیغام اقبال کو عمومی طور پر پیش کرنے کے علاوہ' اس میں کلام اقبال کی تشریح مسلسل اور التزاماً" شائع ہونا چاہئے۔ چنانچہ اس کے لئے سب سے پہلے مثنوی اسرار و رموز کا انتخاب کیا گیا کہ حضرت علامہ کی پہلی مطبوعہ کتاب بھی یہی تھی۔ 1955ء سے 1959ء تک اس مثنوی کی شرح طلوع اسلام میں شائع ہوتی رہی' جو' اب کتابی شکل میں شائع کی جا رہی ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ سے' ملت اسلامیہ پاکستانیہ' قوالوں والے اقبال سے قطع نظر' اس حقیقی اقبالؒ سے آشنائی حاصل کر سکے گی جس کے روز و شب' اپنی امت مسلمہ کے لئے اندیشہ ہائے فکر و غم سے روشن رہتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ اسے' پرویزؒ صاحب کے تبحر علمی کے اس گوشہ سے بھی آگاہی مل سکے گی اور پھر شاید اسے یہ احساس محرومی بھی ہو کہ پرویز صاحب کی یہ شرح اس کے سامنے اب تک کیوں نہ آسکی۔

ایک وضاحت جو نہایت ضروری ہے! ہمارے ہاں کا اہل علم و تحقیق "طبقہ آئے دن اس نکتہ پر بحث کرتا ہے کہ' حضرت علامہ کے فلسفہ اور فکر کے ماخذ کیا تھے یعنی انہوں نے یہ خیالات کہاں سے لئے تھے۔ کوئی ایک اگر اس کے لئے نطشے کا نام لیتا ہے تو دوسرا برگسان کا۔ کوئی انہیں الیگزنڈر کا خوشہ چیں بتاتا ہے' تو کوئی سپنوزا کا۔ کاش ان میں سے کوئی خود اقبال سے بھی پوچھ لیتا کہ آپ کے فلسفہ و پیغام کے ماخذ کیا ہیں۔

علامہ اقبال نے اس بارے میں اتنی وضاحت سے بات کی ہے کہ اس کے پیش نظر' اس باب میں کوئی ابہام نہیں رہتا۔ وہ مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق میں کہتے ہیں کہ

برگ و سازِ ما کتاب و حکمت است
ایں دو قوت اعتبارِ ملت است

اور

غیرِ قرآن غم گسار من نہ بود
قوتش ہر باب را برمن کشود

اسی لئے

گوہرِ دریائے قرآں سفتہ ام
شرحِ رمزِ صبغۃ اللہ گفتہ ام

انہوں نے زیر نظر مثنوی کے آخری باب "عرض حال مصنف بحضور رحمتہ للعالمین" میں اس سوز و گداز سے کہا ہے کہ اگر اس کے برعکس صورت یہ ہو کہ:

گر دلم آئنہ بے جوہر است
ور بحرفم غیر قرآں مضمر است

تو

پردۂ ناموس فکرم چاک کن
ایں خیاباں را ز خارم پاک کن

اور اس کے بعد اپنے لئے اتنی سخت تعزیر قبول کرتے ہیں کہ حضورؐ سے عرض کرتے ہیں کہ ایسی صورت میں

روز محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسہ پاک کن مرا

لیکن اگر میرا یہ دعویٰ درست ہے کہ

گر در اسرار قرآں گفتہ ام
با مسلماناں اگر حق گفتہ ام

تو

عرض کن پیش خدائے عزوجل
عشق من گردد ہم آغوش عمل
در عمل پائندہ تر گرداں مرا
آب نیسانم گہر گرداں مرا

ان اشعار کا مفہوم و مطلوب آپ خود کتاب سے پڑھیں گے تو آپ کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔

یہ کتاب' یوں تو مثنوی اسرار و رموز ہی کی شرح پر مشتمل ہے لیکن' چونکہ پاکستان کا تصور حضرت علامہ نے دیا تھا اور اس مجوزہ مملکت میں قرآنی نظام کے قیام کا ایک حسین تصور' ان کی آرزوؤں کا محور تھا' اس لئے' اس موضوع پر ہم نے ان کے 'جاوید نامہ' سے 'شہر مرغدین' کا باب بھی اس میں شامل کر دیا ہے۔

'شہرمرغدین' اقبالؒ کے نزدیک ایک ایسی حسین اور سرسبز و شاداب (تصوراتی) بستی ہے جس کا نظام' دین کی بنیادوں پر استوار ہے۔اس سے یہ بھی ظاہر ہو سکے گا کہ پاکستان کے لئے' ان کے ذہن میں کس قسم کے معاشرتی نظام کا نقشہ تھا۔

تبصرہ نگار
محمد عمر دراز

حواشی۔

(1) "تصوف کی حقیقت" از پرویزؒ صاحب باب رہ و رسم منزلہا' (2) "لغات القرآن" از پرویزؒ صاحب' جلد اول ایڈیشن 1984ء ص 19' (3) "اقبال کے حضور۔ نشستیں اور گفتگوئیں" از سید نذیر نیازی ص 36' (4) "حسن کردار کا نقش تابندہ" از پرویزؒ صاحب۔ ایڈیشن 1995ء ص 86' (5) "اقبال اور قرآن" از پرویزؒ صاحب۔ باب مجلس قلندران اقبال' (6) "علامہ اقبالؒ' قائداعظمؒ' پرویزؒ' مودودی اور تحریک پاکستان" از چوہدری حبیب احمد۔ ص 165

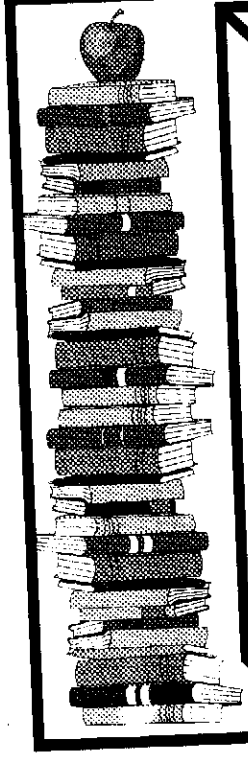

طلوع اسلام ٹرسٹ
کی
حیات بخش تصنیف
جہاد

جہاد کیا ہے؟ جہاد اور جنگ میں فرق؟ مومن اور مجاہد کس طرح مرادف الفاظ میں؟ قرآن کی رو سے قوانین جنگ کیا ہیں؟ اسلامی جنگوں کے متعلق معترضین کے اعتراضات اور ان کے مدلل جوابات۔

علامہ غلام احمد پرویزؒ کی یہ مختصر لیکن جامع تصنیف تیاری کے آخری مراحل میں ہے۔ اس کتاب کی طباعت نو کے لئے ہم محترمہ آمنہ خاتونؒ کے ممنون ہیں۔

مینیجر طلوع اسلام ٹرسٹ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شائستہ اشرف (بھلوال)

افلا تتفکرون

اس نے کہا' ہماری پارٹی میں آجاؤ۔ ہمارا منشور بہت اچھا ہے۔ ہم تکریم انسانیت کے داعی ہیں۔ ہم درسگاہوں میں امن قائم کرنا چاہتے ہیں۔ جواب ملا' سوچوں گا۔

دوسرے گروہ نے کہا' "ارے بھائی تم کہاں بھٹکتے پھر رہے ہو۔ ہماری جماعت بھٹکے ہوؤں کو راستہ دکھاتی ہے۔ ہم محبتوں کے پیامبر ہیں۔ تمہیں وہ سب کچھ ملے گا جس کے تم متلاشی ہو۔ تم اس کو join کر کے تو دیکھو۔" لیکن اس نے انہیں بھی یہی کہا' سوچوں گا۔

آیئے آیئے' ہم تو پہلے ہی جانتے تھے آپ اسی پارٹی کو اپنائیں گے۔ آخر اپنائیں بھی کیوں نہ ہم مادر وطن کی آزادی کے حامی ہیں' ہم غرباء اور مزدوروں کے حقوق کی نگہداشت کرنے والے ہیں۔ ہم ان کو روٹی' کپڑا اور مکان جیسی بنیادی ضروریات زندگی فراہم کرنے کا تہیہ کیئے ہوئے ہیں۔ کیا خیال ہے آپ کا' join کر رہے ہیں؟" دیکھئے محترم لیڈر! میں آپ کے بارے میں بھی سوچوں گا۔

اوہ! یہ شور کیسا ہے؟ شاید کوئی بحث ہو رہی ہے۔ اس نے قریب جا کے دیکھا تو مختلف فرقوں اور عقیدوں کے لوگوں میں گرما گرم بحث ہو رہی تھی۔ ہر کوئی اپنے اپنے فرقے کے حق میں دلائل دینے کی سرتوڑ کوشش کر رہا تھا۔ کئی ایک آوازیں اس کی سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔ "ہمارے امام کا تمہارے امام سے اختلاف برحق ہے"۔ "نہیں ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ ہمارا طریق عبادت زیادہ صحیح ہے' تم لوگ کفر کے قریب ہو"۔ "ہمارا مسلک اسلام سے زیادہ قریب ہے"۔ "رسول پاکؐ کی سنت کا ہم زیادہ اتباع کرتے ہیں"۔ "ہماری تفسیر قرآن زیادہ صحیح ہے"۔ "ہمارے علماء زیادہ متقی اور جید ہیں"۔

وہ سن رہا تھا' سوچ رہا تھا' اس کا ذہن سلگ رہا تھا۔ یہ سب کیا ہے؟ کونسا مسلک اسلام سے زیادہ قریب ہے؟۔ درحقیقت اسلام ہے کیا؟ دین میں اتنی تفرقہ بازی کیوں؟ ہماری یہ حالت کیوں ہے؟ یکایک اس کے ذہن میں سورۂ آل عمران کی وہ آیت گونجی جو آج ہی اس نے کلاس میں پڑھی تھی "**يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ**....." "اے اہل کتاب تم ابراہیمؑ کے بارے میں جھگڑا کرتے ہو' حالانکہ تورات اور انجیل اس کے بہت بعد نازل ہوئی تھیں۔ تو کیا تم عقل نہیں رکھتے؟ تم نے ان باتوں کی بابت بھی جھگڑا کر کے دیکھ لیا جن کے بارے میں تمہیں کچھ علم تھا (مگر منہ کی کھائی) اس کے بعد سوچو کہ ان معاملات میں کیا جھگڑ سکو گے جن کے بارے میں تمہیں سرے سے علم ہی نہ تھا۔ (ذرا بتاؤ تو مسلک ابراہیمیؑ کیا تھا؟) تمہیں اس کی بابت کچھ علم نہیں اور جھگڑتے ہو اس خدا کے ساتھ جسے اس کا پورا پورا علم ہے۔ یاد رکھو! ابراہیمؑ نہ تو یہودی تھا نہ نصرانی۔ یہ تمہاری خودساختہ نسبتیں ہیں۔ وہ خالص

مسلم تھا- وہ دین میں گروہ بندیاں پیدا کرنے والے مشرکین میں سے نہیں تھا- یہ کچھ تم ہی کرتے ہو"-

اس نے سوچا- ہماری بھی تو یہی حالت ہے- ہم فرقوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں- شیعہ کہتا ہے ہم سنت کا زیادہ اتباع کرتے ہیں- سنی کہتا ہے ہم اصل مسلمان ہیں- اہلحدیث کہتا ہے ہم اسلام سے زیادہ قریب ہیں- ہر دیو بندی' ہر بریلوی اور نہ جانے کون کون اسلام کو اپنے اصولوں اور اپنی مرضی کے بنائے ہوئے قوانین کی طرف کھینچتا ہے- اور پھر مزے کی بات یہ کہ ہم سب نہایت خلوص دل سے کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں- ہم اسلام کے سب سے زیادہ قریب ہیں- ہم سنت نبویؐ کے پیروکار ہیں- باوجود اتنے تفرقات کے !! مقام حیرت ہے کہ ہم پھر بھی مسلمان ہیں؟؟؟

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا جیسے بنیادی اصول کو ہم صرف سر دھن کر پڑھ لینے پر ہی اکتفا کرتے ہیں- کیوں ہے ایسا؟ آخر وہ کیا عقدہ ہے جو مجھ سے حل نہیں ہو رہا' مفکرین سے حل نہیں ہو رہا- یہ تفرقہ بازی دین اسلام میں کیوں ہے- عین اسوقت اس کے ذہن میں اس آیہ مبارکہ کی بازگشت سنائی دی- **اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ** اسے ایک دھچکا سا لگا- اس نے سوچا قرآن تو بتاتا ہے کہ اسلام "دین" ہے- اور ہم آج تک اسے مذہب کہتے اور بحیثیت مذہب اپناتے چلے آرہے ہیں اور مفکرین کی توجیہہ کے مطابق تو مذہب نام ہے بندے اور خدا کے درمیان پرائیویٹ تعلق کا- جبکہ دین نام ہے بحیثیت اجتماعی قرآن کریم کے ابدی اور غیر متبدل اصول و قوانین کے مطابق امت مسلمہ کی نشوونما کا اور اس عالمگیر نظام فطرت میں نہ ملوکیت کے لئے کوئی گنجائش ہے نہ پیشوائیت اور سرمایہ داری کے لئے-

اس کے ذہن میں خیال ابھرا- یقیناً انہی "بیماریوں" کی وجہ سے ہم قعر مزلت میں گرے ہوئے ہیں- تاریخ شاہد ہے کہ انہی تین بیماریوں کے باعث قومیں زوال پذیر ہوتی ہیں- قرآن کے بیان کے مطابق صرف وہی قومیں نشوونما پا سکتی ہیں اور انہی کی کھیتیاں پروان چڑھ سکتی ہیں جو قوانین ربوبیت کی حامل ہوں- تو گویا شجر اسلام ثمربار اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہم اس کی آبیاری اپنے نشوونما دینے والے کے غیر متبدل قوانین کے مطابق کریں- اس نے سوچا ہماری راہنمائی کا تو ہر ہر پہلو اس لاریب کتاب میں موجود ہے اور ہم ہیں کہ چہارسو بھٹکتے پھر رہے ہیں اور اس کتاب کو جس میں نظام حیات ہے' بڑی عقیدت سے ریشمی غلافوں میں لپیٹ کر طاق نسیاں کر دیتے ہیں- قرآن جو زبان حال سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ مجھ پر غور و فکر کرو' اندھی تقلید اور اسلاف پرستی کے شرک سے نکلو تو اس کا ہم پر اثر ہی نہیں ہوتا- واہ- ہم بھی کیا مسلمان ہیں **اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ' اَفَلَا تَتَدَبَّرُوْنَ** کو بار بار عقیدت سے پڑھ کے گزر جاتے ہیں-

یہ سب کچھ اگر درست نہیں تو اٹھو اور ابدی صداقتوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہو- اللہ کی کتاب عظیم پر غور و فکر کرو اور مذہب کے بنائے ہوئے پرفریب بتوں کو مسمار کر دو- حضور نبی اکرمؐ کا اسوہ حسنہ نگاہوں کے سامنے رکھو تاآنکہ تمہاری دنیا خالق کائنات کے نور سے جگمگا اٹھے-

ARAB TIMES

TUESDAY, APRIL 16, 1996

A section of the audience pose for photograph with Ubaid-ur-Rehman Arian (sitting left) and Pakistan's Ambassador Karamatullah Khan Ghori (centre)

'Purely an educational movement'

Bazem Tolu-e-Islam holds confab

BAZEM Tolu-e-Islam Kuwait held an educational session over the weekend at its office in Hawalli. Pakistan's Ambassador to Kuwait Karamatullah Khan Ghori was the chief guest who delivered a lecture on "Pakistan and Sectarianism."

The session started with the recitation from the Holy Quran by Riaz Khawar. Bazem Tolu-e-Islam's representative Ubaid-ur-Rehman Arian welcomed the chief guest and the audience.

Briefing the audience on the manifesto of the Bazem Tolu-e-Islam, Ubaid Arian said, that it is purely and definitely an educational movement which believes to train the nation according to the teachings of the Quran and Sunnah.

"We have always condemned all sorts of violence and have tried to make the nation think on Quranic ways as we believe that the nations are build with education and not with rioting or violence. We have always urged the people in power that society can't be reformed through punishments, but by moldings the thoughts of the people," Ubaid said.

Further he said, that Tolu-e-Islam was not a sect by any means as this educational movement has always condemned sectarianism.

" We believe in the only authority of the Holy Quran and Sunnah of the Prophet (PBUH) and our whole literature is a witness to it," he concluded.

The Pakistani ambassador Karamatullah Khan Ghori, in his lecture detailed the religious and political sectarianism and their impact on Pakistan society. He further said, that every aspect of our national life was under the shadow of this curse.

" The sectarianism is an old age ailment of our nation and to have its cure was the need of the hour.

"The life of the Prophet of Islam (PBUH) is a beacon of light and model for us to follow and we should get rid of any sort of sectarianism to be a true follower," the ambassador explained.

Ambassador urged unity according to the teaching of Islam, the Prophet (PBUH) and the founder of Pakistan Quaid-e-Azam Mohammad Ali Jinnah.

"Ignorance is a fuel for sectarianism so we can fight this scourge by educating our youth toward a right direction. Spread of right education can control the fire of ignorance and sectarianism," he opined

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پاکستان اور فرقہ واریت

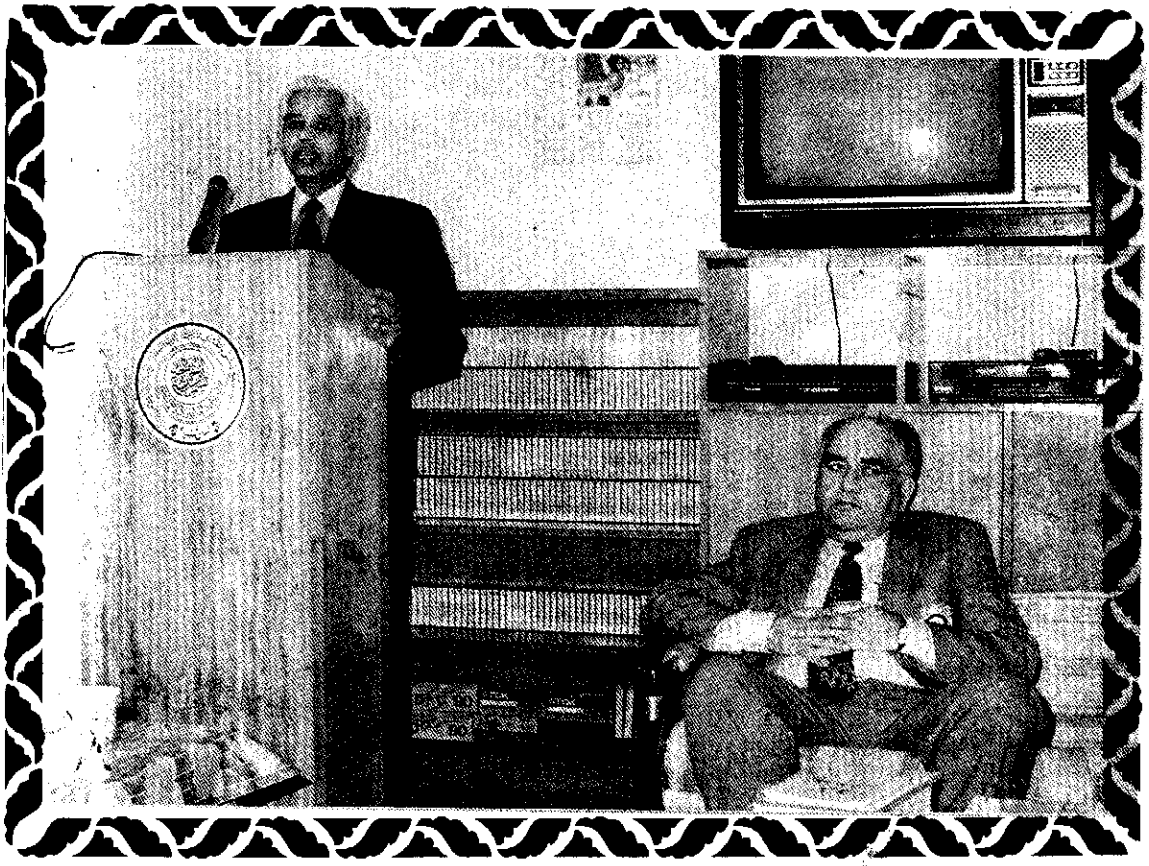

گذشتہ ماہ بزم طلوع اسلام کویت کے زیر اہتمام ایک علمی نشست منعقد کی گئی جس میں سفیر پاکستان جناب کرامت اللہ خان غوری نے پاکستان اور فرقہ واریت کے موضوع پر اظہار خیال فرمایا۔ ذیل میں آپ کے خطاب کا مکمل متن طلوع اسلام کے قارئین کے استفادہ کے لئے پیش کیا جا رہا ہے۔ (مدیر)

جناب عبدالرحمان ارائیں صاحب و معزز حاضرین گرامی ! السلام علیکم ورحمتہ اللہ و برکاتہ' میں عبید صاحب کا مشکور ہوں کہ انہوں نے مجھے یہاں آنے کے لئے اور آپ احباب سے کلام کرنے کی

سعادت حاصل کرنے کا موقعہ فراہم کیا۔ اس سے پہلے کہ میں آج کی شام کو' جو موضوع سخن مجھے دیا گیا ہے اس پر اپنے تاثرات پیش کروں۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ آپ کے سامنے ایک دو چیزوں کی ضروری وضاحت پیش کروں۔

پہلی بات تو یہ کہ آج کی شام میں آپ کے سامنے سفیر پاکستان کی حیثیت سے نہیں حاضر ہو رہا۔ اس لئے کہ سفیر پاکستان کی حیثیت سے اگر میں آپ کے سامنے آنا چاہتا تو میں اس قسم کے موضوع پر گفتگو کرنے کے لئے کبھی سفیر کا چولا پہن کر اس منبر پر کھڑا نہ ہوتا۔ اس لئے کہ سفراء عام طور پر اختلافی یا نزاعی موضوعات پر اپنی رائے کا اظہار کرنا پسند نہیں کرتے۔ بہت سی مصلحتیں ہوتی ہیں' بہت سی مجبوریاں ہوتی ہیں جن کی وجہ سے زبان کھولنے پر زبان بندی کو فوقیت دی جاتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ آج کی شام جو آپ کے سامنے آیا ہوں تو میں نے یہ جسارت اس بنیاد پر نہیں کی ہے کہ مجھے بزعم خود کوئی مبلغ ہونے کا دعویٰ ہے یا میں اپنے آپ کو اسلام کا یا مذہب کا یا تاریخ کا یا پاکستانیات کا سکالر سمجھتا ہوں۔ مجھے اپنے بارے میں اس قسم کی کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔ میں آج کی شام آپ کے سامنے اس بزم میں صرف اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ مجھے پاکستان سے محبت ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہاں جتنے سامعین موجود ہیں ان سب کو پاکستان سے محبت ہے۔ اور پاکستان سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ اگر پاکستان کے جسد کو کوئی امراض لاحق ہیں' اگر پاکستان کی ملت کو مسائل کا سامنا ہے' تو ہم ان مسائل پر اس طرح سے غور کریں اور جائزہ لیں جس طرح پڑھے لکھے ذہن کسی موضوع پر سوچتے ہیں۔ بہت عام سی بات ہے۔ کہ جس فرد سے آپ کو محبت ہوتی ہے' اگر اس کو ذرا سی بھی تکلیف پہنچ جائے تو آپ کو اپنی روح کے اندر کرب اور تکلیف کا احساس ہوتا ہے۔ یہی کیفیت قوموں اور اوطان کی بھی ہے۔ اگر وطن کی مٹی سے آپ کو محبت ہے تو پھر یقیناً وطن کو جو بھی مسائل لاحق ہوں ان پر غور و فکر کرنا آپ کے لئے ضروری ہی نہیں بلکہ لازم ہو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح مسلمان ہونے کے ناطے سے آپ پر یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ آپ دن میں پانچ بار نماز پڑھیں اور خدا سے اپنی محبت اور اطاعت کا عملی ثبوت پیش کریں۔ میں زور دے رہا ہوں "عملی" پر اس لئے کہ زبانی دعوے کرنا بہت آسان ہے۔ یہ کہہ دینا کہ ہمیں فلاں سے محبت ہے' فلاں نظریئے سے محبت' فلاں مٹی سے محبت ہے۔ بہت آسان ہے۔ لیکن اس کا عملی ثبوت پیش کرنا خاصا مشکل کام ہے اور میں یہیں سے اگر اپنے موضوع کا نقطہ آغاز کروں تو کچھ ایسا بے محل بھی نہیں ہو گا۔

ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہم اسلام اور پاکستان دونوں سے اپنی محبت کے زبانی دعوے تو بہت کرتے ہیں لیکن جہاں مسائل کا ذکر آتا ہے وہاں عام طور پر ہم یا تو گروہی اختلافات کو اپنی پناہ بناتے ہیں یا پھر ذاتی تنازعات اور جھگڑوں کی آڑ میں مسائل کو سمجھنے اور ان کا ادراک کرنے میں پہلو تہی کرتے ہیں اور میں یہ کہتا ہوں کہ وہ لوگ جو مسائل پر گفتگو کرنا نہیں جانتے یا نہیں چاہتے تو اس کی صرف اور صرف ایک وجہ ہوتی ہے۔ اور وہ وجہ ہے جہل ! آدمی صرف ان موضوعات پر گفتگو کرنا نہیں چاہتا جن کے متعلق اسے علم نہیں ہوتا اور اس جہل کو

چھپانے کے لئے لوگ بہت سے چولے بدلتے ہیں اور مختلف انداز فکر کو اپنے لئے ڈھال بناتے ہیں۔

پاکستان اور فرقہ واریت کے حوالے سے پہلی بات تو یہ سمجھئے کہ فرقہ واریت کسے کہتے ہیں؟ فرقہ کیا چیز ہوتی ہے؟ فرقہ پیداوار ہے فرق کی۔ اگر آپ اپنے آپ کو مجھ سے مختلف سمجھتے ہیں تو آپ کا فرقہ الگ ہے اور میرا فرقہ الگ ہے۔ فرقے کا منطقی نتیجہ تفریق ہے اور اس کا عملی نتیجہ انتشار ہے۔ انتشار کا دوسرا مطلب ہے مرکز کا کھو جانا یا مرکز سے روگردانی کرنا۔ اصل ضرورت ہمیں صرف ایک بات کو سمجھنے کی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اسلام کا مرکز کیا ہے؟ اس لئے کہ جو لوگ مرکز کو چھوڑ دیتے ہیں وہی گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ابھی آپ کے سامنے آیات قرآنی کی تلاوت کی گئی اور ان کا ترجمہ پیش کیا گیا۔ وہی لوگ گروہوں میں بٹتے ہیں' وہی بھٹکتے ہیں' وہی منقطع ہوتے ہیں جو مرکز کو بھول جاتے ہیں یا مرکز سے روگردانی کرتے ہیں یا مرکز سے دور چلے جاتے ہیں۔ (سورہ البقرہ آیت نمبر 213)_ اسلام کا مرکز کیا ہے؟ اسلام کا محور قرآن ہے! جو ہم سب کے لئے راہ ہدایت ہے۔ یہ صحیفہ آسمانی ہے اور ظاہر ہے کہ خدا کا جو کلام ہے اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔ اس میں کوئی جھول نہیں ہو سکتا اور اس میں کوئی کسک نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح اس قرآن کو لیکر آنے والا جو تھا وہ بھی ہم سب کے لئے منبع ہدایت ہے۔ رسول اکرمؐ کی ذات پاک جنہوں نے اپنی زندگی میں قرآن کی عملی تفسیر پیش کی۔ وہ بہت مشہور حدیث ہے:

حضرت عائشہؓ سے کسی نے سوال کیا تھا کہ قرآن کو ہم کس طرح سے سمجھیں تو انہوں نے فرمایا تھا کہ قرآن کو رسولؐ کی ذات کے ذریعے سے سمجھو اس لئے کہ رسول جو تھے وہ چلتا پھرتا قرآن تھے اب اس چلتے پھرتے قرآن نے آپ کے لئے کس مرکز کی نشاندہی کی؟ میں صرف ایک حوالہ آپ کو دونگا۔ (وقت کی کمی کی وجہ سے) اور وہ حوالہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ رسولؐ کا مشن ختم ہونے کو تھا اور آپؐ کی حیات ارضی کے آخری ایام تھے جب آپ نے خطبہ حجتہ الوداع دیا۔ اس خطبہ میں رسولؐ نے امت کے لئے اور آنے والی تمام نسلوں کے لئے ایک سرچشمہ ہدایت چھوڑا اور وہ سرچشمہ ہدایت یہ تھا کہ تم میں کسی کو کسی پر فوقیت نہیں ہے نہ عربی کو عجمی پر' نہ گورے کو کالے پر' نہ امیر کو غریب پر اور نہ طاقت ور کو کمزور پر۔ اگر تم میں کسی کو کسی پر امتیاز ہے تو وہ صرف اور صرف تقویٰ کی بنیاد پر ہے۔ اب آپ صرف ان چند جملوں پر غور کیجئے اور ان کی روشنی میں ملت اسلامیہ کا جائزہ لیجئے بلکہ میں کہتا ہوں کہ ان جملوں کی روشنی میں پوری عالم انسانیت کا جائزہ لیجئے۔ رسولؐ نے جب یہ فرمایا کہ عربی کو عجمی پر فوقیت نہیں تو آپؐ کے اس قول سے ہر طرح کے لسانی تعصب کی تنقیص ہو گئی۔ بہت مشہور بات ہے کہ اہل عرب کو اپنی لسانی فصاحت پر اتنا ناز و فخر تھا کہ وہ باقی تمام دنیا کو عجمی یعنی گونگا کہتے تھے۔ لسانی تعصب کی بنا پر لوگ اپنے آپ کو دوسرے سے برتر سمجھتے ہیں جو آگے چل کر فساد اور خونریزی پر منتج ہوتی ہے۔ تو لسانی تعصب کی یہ کہہ کر کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر فوقیت نہیں اس بات کو ہمیشہ کیلئے مسترد کر دیا۔ اسی طرح جب رسولؐ نے کہا کہ کالے کو گورے پر فضیلت حاصل نہیں تو آپؐ نے نسلی تعصب کو رد کر دیا۔ اس دور میں آپ نے

دیکھا ہے کہ نسل اور رنگ کی بنیاد پر ایک قوم نے دوسری قوم کو کتنا تباہ و برباد کیا ہے۔ اور صرف اس بنیاد پر کہ ہم نسلی اعتبار سے دوسری نسل سے برتر ہیں۔ کتنا انسانی خون ناحق بہایا گیا ہے۔ تیسری بات رسولؐ نے یہ فرمائی کہ امیر کو غریب پر اور طاقت ور کو کمزور پر فوقیت نہیں ہے۔ رسولؐ کے اس قول نے عصبیت کے مرض کی ہمیشہ کیلئے تردید کر دی۔ وہ عصبیت کہ جو انسانوں کو گروہوں میں بانٹ دیتی اور انہیں کبھی بھی امت واحدہ بننے نہیں دیتی۔ میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہوں گا۔ اس لئے کہ میرا موضوع اسلام اور فرقہ واریت نہیں ہے بلکہ پاکستان اور فرقہ واریت ہے۔ اب میں پاکستان بنانے والے شخص کی طرف آتا ہوں اور اس بات پہ نہ صرف آج کا مئورخ متفق ہے بلکہ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آنے والا مئورخ بھی۔ ہر وہ شخص' ہر وہ سکالر' ہر وہ صاحب علم' ہر اہل دانش' تاریخ کا ہر وہ طالب علم جو آئندہ بھی پاکستان اور برصغیر میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ یا جدوجہد آزادی میں مسلمانوں کے کردار پر بحث کرے گا تو وہ صرف یہی نتیجہ اخذ کریگا کہ اگر قائداعظم محمد علی جناح کی ذات نہ ہوتی تو ناممکن تھا کہ آج آپ اپنے آپ کو پاکستانی کہنے کے حقدار ہوتے۔ وہ ایک شخص تھا جس نے بہت سے محاذوں پر جنگ لڑی۔ اپنے لوگوں سے بھی لڑا اور غیروں سے بھی۔ (میرے پاس پھر وقت نہیں ہے کہ میں پاکستان کی اور جدوجہد آزادی کی تاریخ پر تفصیل کے ساتھ بالاستیعاب بحث کروں) لیکن آپ سب کو معلوم ہے کہ کتنے لوگ تھے جو قائداعظم کو کافراعظم کہا کرتے تھے۔ قائداعظم محمد علی جناح نے مختلف محاذوں پر جنگ لڑی اور اپنی شخصیت کے بل بوتے پر' اپنی اصابت رائے اور واضح کردار کے بل بوتے پر آپ کے لئے' ہمارے لئے' ہماری آنے والی نسلوں کے لئے وہ ملک حاصل کیا جسے ہم مملکت خداداد پاکستان کہتے ہیں۔

آپ سب کو معلوم ہے کہ پاکستان بننے کے بعد قائداعظم علیہ الرحمہ کو بہت کم وقت ملا۔ میں نہیں جانتا کہ یہ کیوں ہوا؟ قدرت کو کیا منظور تھا؟ میں صرف ایک بات سمجھتا ہوں اور وہ یہ کہ قدرت نے قائداعظم کو ایک سال کے اندر اندر یوں اٹھایا کہ وہ پاکستانی قوم کا امتحان کرنا چاہتی تھی۔ وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ جن لوگوں کو ہم نے اپنی قدرت سے ایک آزاد مملکت عطا کی ہے۔ ایک ایسا خطہ زمین بخشا ہے جہاں وہ اپنے دعووں کے مطابق ایک ایسی مملکت کی تشکیل کر سکیں جو یہ ثابت کر سکے کہ اسلام اس بیسویں صدی میں بھی اتنا متحرک' اتنا قوت والا ہے کہ وہ مختلف زبانیں بولنے والے لوگوں کو اور مختلف رنگ و نسل کے لوگوں کو ایک ایسی رسی میں باندھ سکتا ہے کہ وہ اپنے تمام تفرقات کو بھلا کر' اپنے تمام امتیازات کو پس پشت ڈالکر اپنے آپ کو ایک ملت واحدہ میں تبدیل کر سکتی ہے۔ یہ وجہ تھی کہ قائداعظم علیہ الرحمہ کی آنکھ پاکستان بننے کے ایک سال کے اندر اندر بند ہو گئی۔ میں پھر اپنے موضوع کی طرف لوٹتا ہوں کہ قائداعظم نے آپ کے لئے کون سی مشعل راہ چھوڑی تھی؟ کون سا مرکز تھا کہ جس کی قائداعظم نے نشاندہی کی تھی؟ اس کے لئے آپ کو قائداعظم کا وہ تاریخی خطبہ دیکھنا ہو گا جو انہوں نے 11 اگست 1947ء کو پاکستان بننے سے تین دن پہلے پاکستان کی مجلس دستور ساز میں دیا تھا۔ مجھے یاد ہے' کوئی زیادہ پرانی بات نہیں (مشکل یہ ہے کہ

ان معاملات میں ہم لوگوں کی یادداشت خاصی محدود ہوتی ہے) پاکستان میں ایک دور ایسا آیا تھا کہ قائداعظم کا یہ (11 اگست 1947ء) خطبہ ڈھونڈنے سے نہیں ملتا تھا۔ لوگوں کو لائبریریوں میں جا کے کتابوں میں دیکھنا پڑتا تھا کہ قائداعظم نے 11 اگست 1947ء کو جو خطبہ دیا تھا اس میں کیا بات کی تھی کہ جس کی اب لوگ پردہ پوشی چاہتے ہیں۔ جس پر لوگ اب گرد زمانہ ڈال دینا چاہتے ہیں تاکہ آنے والی نسلیں اس روشنی سے محروم رہیں جو پاکستان قائم کرنے والے نے آنے والی نسلوں کے لئے چھوڑی تھی۔ میں آپ کے سامنے قائداعظم کے خطبے کی وہ تحریر پڑھنا چاہوں گا۔ اس لئے کہ اس کو مشعل راہ بنا کر میں آج کے موضوع پر آپ سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ قائداعظم نے کہا تھا۔ (ہندو اور مسلمانوں کا بلکہ پوری پاکستانی قوم کا ذکر کرتے ہوئے) :

"All These angularity of the majority and the minority community, the hindu community and the Muslim community will banish. And you will find that hindu will Lease to be Hindu and muslim will Lease to be Muslim not in the religious sense because that is the personel faith of each individual (بہت غور کرنے والی بات ہے) but in the political sense as citizen of the state ———

اور آگے چل کر اسی خطبے میں کہا تھا

---- You are free to go to your temples; you are free to go to your mosques; or to any place of worship you may belong to any religion or Cast or Creed that has nothing to do with the business of the state ------"

"--- اقلیت اکثریت ہندو و مسلم کی تمام تفریقات مٹ جائیں گی اور آپ دیکھیں گے کہ ماسوائے مذہبی امور کے کیونکہ وہ ہر ایک کا ذاتی ایمان ہے' جہاں تک ملکی امور کا تعلق ہے پاکستان کا شہری ہونے کی حیثیت سے ہندو' ہندو نہیں رہے گا اور مسلمان' مسلمان نہیں رہے گا (خطبے میں آگے چل کر کہا) ــــ آپ کو آزادی ہو گی کہ آپ اپنے مندر کو جائیں' آپ اپنی مسجد کو جائیں یا کسی بھی عبادت گاہ کو جائیں۔ آپ کا تعلق خواہ کسی بھی مذہب یا عقیدے یا ذات سے ہو۔ ریاست کے امور سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہو گا۔"

یہ وہ خطبہ ہے جو ایک زمانے میں پاکستان میں تقریباً ناپید ہو گیا تھا۔ اور یہ اس لئے ہوا تھا کہ اس زمانے کی حکومت نظریہ پاکستان کی جو توضیح اور تعبیر کر رہی تھی اس میں قائداعظم کا یہ خطبہ کہیں فٹ نہیں ہوتا تھا۔ میں آج کے تناظر میں قائداعظم کی اس بات پر زور دے رہا ہوں تو یہ اس لئے ہے کہ ہمارے جسد ملت میں جو یہ امراض پیدا ہوئے ہیں وہ اس بنیادی حقیقت کو فراموش کر دینے کی وجہ سے ہیں۔ بہت عام سی بات ہے۔ ہر شخص یہ کہتا ہوا ملتا ہے کہ پاکستان میں فرقہ واریت کو ہوا دی گئی ہے لیکن یہ کوئی نہیں بتاتا کہ فرقہ واریت کو ہوا دینے والے کون ہیں اور فرقہ واریت کو ہوا کس لئے دی گئی ہے؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ تعصب صرف ان ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے جن میں علم کی روشنی نہیں ہوتی' نور نہیں ہوتا' جہالت کی تاریکی ہوتی ہے۔ جہاں جہالت کی گمراہی ہوتی ہے۔

ابھی چند لمحے پہلے آپ کے سامنے عبدالرحمان صاحب نے کہا ہے اور بالکل صحیح بات کہی ہے کہ لوگ بڑی آسانی سے دوسروں پر لیبل چسپاں کر دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ فلاں جو ہے وہ تو احمدی ہے۔ فلاں پرویزی ہے۔ فلاں شیعہ ہے اور جب ان سے کہا

ہے کہ حضرت یہ بتایئے کہ آپ نے احمدیت کے کو پڑھا؟ یا آپ نے اہل تشیع کے فلسفہ کو پڑھا ۔ اس کو سمجھنے کی کوشش کی ہے؟ یا آپ نے م احمد پرویز کی کتابیں پڑھی ہیں؟ ان کے خطبات ہیں؟ تو وہ کہتے ہیں نہیں نہیں توبہ کرو میں ایسا یں کرونگا۔ کیونکہ اگر میں ایسا کرونگا تو میرا تو ایمان تا رہے گا۔ میں نے ان سب کو پڑھا ہے اور میں رے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں آج بھی ی نظریے پہ قائم ہوں جس نظریئے پہ میں ان لسفوں کو پڑھنے سے پہلے تھا۔ پڑھنے سے اجتناب ون کرتا ہے؟ پڑھنے سے اجتناب صرف وہ کرتا ہے۔ جس کا اپنا ایمان کمزور ہوتا ہے جس کو اپنے وپر یقین نہیں ہوتا۔ اگر آپ کا ایمان اتنا کمزور ہے کہ آپ کسی دوسرے فرقے کے شخص کا ایک خطبہ ھنے سے ڈگمگا جاتے ہیں تو پھر آپ اپنے آپ کو سلمان کہنے اور کہلوانے کے مستحق نہیں ہیں۔ اگر آپ کا ایمان اس قدر کمزور ہے کہ کسی اور فلسفے کو آپ پڑھیں گے تو آپ اپنے راستے سے بھٹک جائیں گے تو پھر آپ کو کوئی حق نہیں ہے کہ آپ یہ دعویٰ کر سکیں کہ نہیں میرا ایمان تو بہت راسخ ہے۔ میں تو بہت کٹر' بہت پکا اور سچا مسلمان ہوں۔ تو بات یہ ثابت ہو گئی کہ صرف وہی لوگ تقابلی جائزے سے گھبراتے ہیں جن کے پاس علم نہیں ہوتا۔ بات بہت غور کرنے والی ہے۔ میں تقابلی جائزے کی بات کر رہا ہوں۔ آج مغرب کی درسگاہوں میں باقاعدہ کورسز ویئے جاتے ہیں۔ اگر آپ پڑھنا چاہیں تو آپ ڈاکٹریٹ تک کی سند حاصل کر سکتے ہیں (مذہبوں کے تقابلی جائزے کی) لیکن ہم مسلمان ایک دوسرے کے فلسفے کو پڑھنے اور سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اس لئے کہ ہمارا خیال یہ ہوتا ہے کہ اگر ہم نے ایسا کیا تو ہمارے ایمان میں فرق آجائے گا۔ یہ خیال درست نہیں ہے۔ یہ جہالت ہے۔ میرے ایک بزرگ دوست نے بہت اچھی بات کہی جو میرے دل کو لگی اور میں چاہتا ہوں کہ آپ کے سامنے اس کو دہراؤں۔ انہوں نے کہا کہ اب جو ہمارے سامنے مسائل ہیں ان سے نبرد آزما ہونے کے لئے ہمیں مناظرے کی ...ت نہیں بلکہ تقابلی جائزے کی ضرورت ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم ایک د... کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس لئے کہ جب تک ہم ایک دوسرے کے نظریے کو جانیں گے نہیں تو ہمارے درمیان فاصلہ کم کرنا کیسے ممکن ہو گا؟

میں قائداعظمؒ کے محولہ بالا ارشادات کی روشنی میں آپ سے یہ کہنے کی کوشش کر رہا تھا کہ پاکستان میں فرقہ واریت کے جو امراض پیدا ہوئے ہیں ان کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم قائداعظم کے فرمان کو بھول گئے۔ قائداعظم کے مشن کو ہم نے فراموش کر دیا۔ اور ظاہر ہے کہ جب آپ کسی گھر کے بنانے والے کو بھول جائیں تو پھر اس گھر سے آپ کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟۔ آپ اگر کسی سے محبت کا دعویٰ کرتے ہیں تو پھر اس کی ذات سے متعلق جتنی بھی چیزیں وابستہ ہوتی ہیں ان سب کو سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ جب تک آپ ذات کا مکمل جائزہ نہیں لیں گے آپ کیسے اس کی جزئیات کو سمجھ سکتے ہیں اور میں یہ بات آج کی شام آپ کے سامنے کھڑے ہو کر کہنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ قائداعظم کے مشن کو فراموش کرنے کا جو کام ہوا ہے وہ یہی نہیں ہوا کہ قوم سے کوئی غلطی ہو گئی۔ نہیں! بلکہ قوم کو بالارادہ اس راہ پر گامزن

کیا گیا ہے کہ جہاں وہ عملاً قائداعظم کے بتائے ہوئے راستے سے دور نکل جائے۔ میں پھر آپ کے سامنے اعادہ کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے نہ مبلغ دین ہونے کا دعویٰ ہے اور نہ ہی میں اپنے آپ کو تاریخ کا' یا معاشیات کا یا معاشرتی جائزوں کا ماہر سمجھتا ہوں۔ جہاں تک میری محدود عقل سمجھ سکتی ہے میں اس نتیجہ پہ پہنچا ہوں کہ پاکستان میں مخصوص مفادات رکھنے والے گروہوں نے بلکہ میں کہوں گا کہ مخصوص مفادات رکھنے والے ایک گروہ نے [redacted] کے فرمودات کو نظرانداز کرنے کے لئے قوم کو اس قسم کی راہ دکھائی کہ قوم ان سے بھٹک جائے۔

میں یہ سمجھتا ہوں اور میں یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ پاکستان میں فرقہ واریت جو ملت پاکستان کی رگوں میں زہر بن کر دوڑ رہی ہے وہ بلاشبہ مذہب کو غلط طور پر سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوئی لیکن سوال یہ ہے کہ پاکستانیوں کو مذہب کو غلط طور پر سمجھنے پر مجبور کس نے کیا۔ خاصی گنجلک بات ہے! جب میں یہ کہتا ہوں کہ پاکستانیوں کو دین کو غلط طور پر سمجھنے پر مجبور کیا تو اس کی بنیاد یہ ہے کہ پاکستانی ذہنوں کو روشن نہیں ہونے دیا اور ذہنوں کو روشن کیوں نہیں ہونے دیا گیا اس کی صرف اور صرف ایک وجہ ہے کہ ہم نے پاکستان بننے کے بعد پاکستان میں علم کے حصول اور تعلیم کے پھیلاؤ پر وہ زور نہیں دیا جس کا یہ شدید متقاضی تھا۔ ہم نے اس کی بجائے پاکستانیوں کو مختلف گروہوں میں بانٹنے کے لئے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ نظریہ پاکستان کی وہ شرح پیش کرنا شروع کی جو پاکستان کو بنانے والے کے ذہن میں نہیں تھی۔ یہ ابھی جو میں نے قائداعظم کے ارشادات آپ کے سامنے پیش کئے ہیں ان کی روشنی میں بہت سا ابہام چھٹ جاتا ہے۔ یہ بات بہت ہی روشن ہو جاتی ہے کہ پاکستان بنانے میں قائداعظم کا نصب العین ہرگز ہرگز یہ نہیں تھا کہ پاکستان کو اسلام کی تجربہ گاہ بنایا جائے(★) اور میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں آج جو فرقہ واریت کا زہر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے پاکستان بننے کے بعد یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ اب یہ ملک جو ہمیں ملا ہے یہ اس لئے ملا ہے کہ ہم اس میں اسلام کی تجربہ گاہ قائم کریں۔ اور یہ جاننے کی کوشش کریں کہ اسلام اصل میں کیا چیز ہے اور پاکستانیوں کو کون سے اسلام پر عمل پیرا ہونا چاہئے اب آپ غور کیجئے کہ یہ جو مختلف مکاتب فکر کی طرف سے یہ بلند و بانگ دعوے کئے جاتے ہیں اور جس کے لئے بہت سے لوگ مختلف وقتوں میں اس قسم کی مہم چلا چکے ہیں کہ پاکستان میں کونسی فقہ کو نافذ ہونا چاہئے۔ یہ بات بالکل اس کے مترادف ہے ناکہ یہ فیصلہ کیا جائے کہ پاکستان میں آخر کون سا اسلام رائج ہو گا۔ تو پاکستان بنانے والے کے ذہن میں اس قسم کی کوئی غلط فہمی نہیں تھی۔ وہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ پاکستان کو اسلام کی تجربہ گاہ بنایا جائے۔ بہت غور کرنے والی بات ہے۔ بہت نازک بات ہے جس کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ پاکستان اس لئے نہیں بنا تھا کہ پاکستان کو اسلام کی تجربہ گاہ بنایا جائے(☆) بلکہ پاکستان اس لئے بنا تھا کہ ہندوستان میں بسنے والے کلمہ گوؤں کے لئے ایک خطہ زمین حاصل کیا جائے جہاں وہ اسی طرح آزادی اور عزت و احترام کے

(★) مفکر پاکستان حضرت علامہ اقبالؒ اور بانی پاکستان حضرت قائداعظمؒ کے نزدیک پاکستان کے قیام کا یہی مقصد تھا۔ انہوں نے اس سلسلہ میں کسی ابہام سے کام نہیں لیا۔ اسی پرچہ میں دیکھئے مضمون "مخلوط انتخابات اور پاکستان"۔ (مدیر طلوع اسلام)

ساتھ رہ سکیں جس عزت و احترام کے ساتھ ہندوستان میں بسنے والی اکثریت رہنا چاہتی تھی۔ پاکستان بنانے کا قائداعظم کے ذہن میں اس کے سوا اور کوئی مقصد نہ تھا۔ لیکن مشکل یہ ہوئی کہ پاکستان بننے کے بعد اس کا بنانے والا تو ایک سال کے اندر چل بسا اور اس کے بعد جو لوگ پاکستان کے مطلع سیاست پر بطل جلیل بن کر ابھرے وہ مخصوص گروہی مفادات کے حامل تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ پاکستان میں تعلیم عام ہو۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ پاکستانیوں کے ذہن علم کی روشنی سے منور ہوں۔ اس لئے کہ ذہن اگر علم کی روشنی سے منور ہو جائیں گے تو پھر مخصوص مفادات کے حامل گروہ کی اجارہ داری کیسے قائم رہ سکے گی اور پاکستان کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ آج تک پاکستان میں سیاست کی باگ ڈور ان ہاتھوں میں ہے جو مخصوص گروہی مفادات کے حامل ہیں۔ جو صرف ان مخصوص مفادات کے فروغ کو ہی اپنی زندگی کا مشن سمجھتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ پاکستانیوں کے ذہن علم کے نور سے منور ہوں۔ نہیں چاہتے کہ پاکستان صحیح طور پر یہ سمجھ سکیں کہ پاکستان کو بنانے کا مقصد کیا تھا؟

یہ ساری برائیاں اس لئے پیدا ہوئی ہیں۔ یہ جو آج پاکستان میں نسلی تعصبات ہیں' یہ جو گروہی تعصبات ہیں' جو مذہبی تفرقے ہیں' یہ صرف اور صرف اس وجہ سے پیدا ہوئے ہیں کہ پاکستانیوں میں علم کی روشنی اس حد تک پیدا نہیں ہونے پائی جس حد تک کہ پیدا ہونی چاہئے تھی۔ ہم یہ کیوں کہتے ہیں کہ تعصب جہل کی پیداوار ہے؟ اس لئے کہ جو ذہن روشن ہوتے ہیں وہ یہ جانتے ہیں کہ کون ہمیں کن نعروں سے گمراہ کر رہا ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کو گمراہ کیوں نہیں کیا جا سکتا؟ اس لئے کہ وہ یہ جانتے ہیں کہ کس حد تک آگے جانے میں ان کیلئے بھلائی اور کس سرحد کو پار کر لینے کے بعد ان کے لئے یہ یہ برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ صرف اور صرف جہالت ہی ایک وجہ ہے جس نے ہمیں ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا ہے۔ پاکستانیوں میں کوئی تفرقہ نہ ہوتا۔ پاکستانی ملت کبھی گردابوں میں نہ بھٹکتی اگر پاکستان میں علم کی روشنی عام ہوتی۔ آج بھی میں دعوے کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر پاکستان کو ترقی کرنی ہے۔ اگر پاکستانیوں کو ان گردابوں سے نکلنا ہے جن میں ملت پاکستان اس وقت پھنسی ہوئی ہے تو اس کے لئے صرف ایک نسخہ ہے۔ صرف ایک کیمیا ہے اور وہ کیمیا ہے علم!

میں آپ کو بے شمار مثالیں دے سکتا ہوں ایسے ملکوں کی جو بیس' پچیس برس پہلے پاکستان سے ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے تھے لیکن آج وہ پاکستان سے بہت آگے نکل گئے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ 1962ء میں جب ہم پاکستان میں ترقیاتی کاموں کے لئے پانچ سالہ منصوبے بنایا کرتے تھے تو عالمی بنک نے کوریا کو جو اس زمانے میں مختلف مسائل کا شکار تھا۔ یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ پاکستان کے ترقیاتی منصوبوں کو اپنے لئے مشعل راہ بنائے۔ کورین (Korean) نے مشعل راہ بنایا۔ وہ آج کہاں پہنچ گئے یہ آپ سب جانتے ہیں۔ پاکستانیوں نے اپنے ہی منصوبوں کو مشعل راہ نہیں بنایا وہ آج کہاں پر ہیں۔ تنزل کی کس پستی میں ہیں وہ بھی آپ سب جانتے ہیں۔ آج پاکستان کی جو اوسط آمدنی ہے اس کے مقابلے میں کوریا کی اوسط آمدنی کم از کم بیس گنا زیادہ ہے۔ یہ فرق کیسے پیدا ہوا؟ اور فرق صرف تیس

برس میں کیسے پیدا ہوا؟ اس طرح پیدا ہوا کہ کوریا میں 1960ء کی دہائی میں جو ایک فوجی انقلاب آیا تھا اس میں کامیاب ہونے والے لیڈر نے سب سے پہلے جو حکم نافذ کیا وہ یہ کہ اس نے اپنے تمام فوجی افسروں سے کہا کہ تم اپنے ہاتھ میں بلیک بورڈ لو' کتابیں لو اور دیہاتوں میں پھیل جاؤ- اس لئے کہ کورین (Korean) کی اس وقت سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ان میں تعلیم عام کی جائے- صرف اور صرف ایک ہی کام ہے- مجھے یاد ہے کہ مصطفیٰ کمال اتاترک نے جب ترکی میں نئی قوم کی تشکیل کرنا شروع کی تو انہوں نے بھی سب سے پہلے یہی کام کیا تھا- انہوں نے اپنے ساتھیوں سے یہ کہا تھا کہ تم ترکی کے طول و عرض میں پھیل جاؤ اور تعلیم کو عام کرو- اس لئے کہ ترک قوم اس وقت تک ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو گی جب تک کہ وہ جدید علوم سے بہرہ ور نہیں ہو گی- اور میں آپ کو چیلنج کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ پاکستانی قوم بھی اس وقت ترقی کی راہ پر گامزن ہو جائیگی جب ملک میں تعلیم عام ہو جائیگی- اس وقت یہ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ہے کہ ہمارے ہاں ہر سال بجائے اس کے کہ دنیا کے دیگر ملکوں کی طرح پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہو- ہمارے ہاں ہر سال جہلاء کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے- یہ اس لئے ہو رہا ہے کہ جس رفتار سے ہماری آبادی بڑھ رہی ہے اس رفتار سے تعلیمی سہولتوں میں اضافہ نہیں ہو رہا- نتیجہ یہ ہے کہ ہر سال پڑھے لکھے لوگوں کا اوسط زیادہ ہونے کی بجائے کم ہوتا چلا جا رہا ہے-

اس سے بڑا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہم نے علم کو بھی خانوں میں بانٹ دیا ہے- اور دین اور دنیا کی تخصیص پیدا کر دی ہے- خدا قرآن میں کہتا ہے کہ تمام مسلمان مردوں اور عورتوں پر علم حاصل کرنا لازمی ہے- اس نے کہیں یہ نہیں کہا کہ صرف دینی علم حاصل کرنا لازمی ہے- رسولؐ نے اپنی حدیث میں یہ فرمایا ہے کہ علم کے حصول کے لئے تمہیں اگر چین بھی جانا پڑے تو تم جاؤ- اس زمانے میں سب سے زیادہ ممکنہ طوالت پر جو ملک ہو سکتا تھا وہ ملک چین تھا- کیا رسول نے یہ کہا تھا کہ تم دین کا علم حاصل کرنے کے لئے چین جاؤ- ظاہر ہے کہ دین کی تعلیم تو وہ خود جزیرہ نما عرب میں دے رہے تھے- وہ کیسے کہہ سکتے تھے کہ تم دین کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے چین جاؤ- رسول اللہؐ کا یہ کہنے سے مقصد یہ تھا کہ اگر علم کا حصول ضروری ہو تو تم صعوبتیں برداشت کر کے دور دراز کا سفر کر کے چین پہنچو تاکہ وہاں پر تمہیں علوم حاصل ہو سکیں- لیکن ہمارا مولوی کیا کہتا ہے؟ ہمارا مولوی یہ کہتا ہے کہ نہیں! تم پر فرنگی کی دی ہوئی تعلیم حاصل کرنا فرض نہیں ہے- سوال یہ ہے کہ فرنگی کے پاس علم کہاں سے آیا؟ کیا اس نے گھر بیٹھ کر سیکھا- نہیں! اس نے بھی اسی سرچشمہ ہدایت سے علوم حاصل کئے ہیں جسے ملت اسلامیہ بھول بیٹھی ہے-

چند برس پہلے پروفیسر عبدالسلام کویت تشریف لائے تھے اور انہوں نے جامعہ کویت میں ایک خطبہ دیا تھا- یہ وہ پروفیسر سلام ہیں کہ جن کو پاکستان میں کافر قرار دیکر اچھوت بنا دیا ہے- یہاں پر انہوں نے اپنی خطبے کے دوران کہا تھا کہ اٹلی میں جس ریسرچ لیبارٹری کا میں سربراہ ہوں اس میں زیادہ تر طلباء تیسری دنیا کے ممالک سے آتے ہیں- اس لئے اس ادارہ قائم ہی تیسری دنیا کے لئے کیا گیا ہے- ان

س کا تمام تر بجٹ جو تقریباً پچاس ملین ڈالر سالانہ ہوتا ہے وہ اٹلی کی حکومت برداشت کرتی ہے۔ ایسے ایسے تونگر اور متمول اسلامی ممالک جن کے اربوں کھربوں ڈالر مغرب کے بنکوں میں جمع ہیں ان میں سے کسی کو بھی اس کی توفیق نہیں ہوتی کہ ایسے ادارے کا بجٹ برداشت کر سکے کہ جس کا سربراہ ایک مسلمان ہے۔ اپنے وقت کا واحد مسلمان سائنس دان جس نے نوبل پرائز حاصل کیا۔ اس ادارے میں ہونے والی ریسرچ کا فائدہ بھی تیسری دنیا کے ممالک کو ہو رہا ہے لیکن کسی مسلمان ملک کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی کہ وہ کم از کم اتنی تو شرم کرے کہ اس ادارے کا بجٹ برداشت کرے۔ جس ملت میں علم کی یہ اہمیت ہو۔ جس میں علم کو اتنی فوقیت بھی نہیں دی جائیگی ظاہر ہے کہ اس میں دین کے نام پر تفرقہ نہیں ہو گا تو اور کیا ہو گا۔ تفرقہ بڑھتا ہی جائے گا اگر علم کی روشنی نہیں پھیلے گی۔ آپ سب ماشاء اللہ اہل دانش ہیں' اہل علم ہیں۔ مجھے آپ کے سامنے مثالیں پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کی نظر تاریخ پر ہے۔ آپ سب جانتے ہیں کہ وہ قوم جو زوال کی راہ پر گامزن ہو جائے پھر اس قوم کا انجام کیا ہو گا؟

ابھی آپ کے سامنے جن آیات قرآنی کی تلاوت کی گئی تھی ان میں بہت واضح طور پر اس حقیقت کا انکشاف کیا گیا ہے کہ تفرقہ تمہیں تباہی کے جہنم میں دھکیل دے گا اور وحدت سے تمہیں سرفرازیاں اور کامرانیاں حاصل ہونگی۔ (سورہ آل عمران آیات نمبر 103-101) اور پوری تاریخ آپ کے سامنے شاہد ہے۔ خدا کو اپنے دین کی حفاظت کے لئے کسی گروہ یا مخصوص لوگوں کی ضرورت نہیں ہے۔ خدا اپنے دین کی حفاظت خود کر سکتا ہے۔ آپ تک جو حفاظت ضروری ہے وہ یہ کہ آپ اپنی حفاظت کریں۔ اور آپ اپنی حفاظت صرف اور صرف اس وقت کر سکتے ہیں جب آپ اس علم کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں جو آپ تک نبی آخرالزمان کے حوالے سے پہنچا ہے۔ اور ملت پاکستانیہ اس طرح اپنی ملی حفاظت کر سکتی ہے جب پاکستان بنانے والے کی تعلیمات کو مشعل راہ بنائے۔ اس طرح یہ اختلاف' گروہ اور تفرقے سب مٹ جائیں گے۔ یہ جو مخصوص مفادات کے گروہ اجارہ دار بن کر بیٹھے ہیں یہ بھی مٹ جائیں گے۔ بشرطیکہ آپ اپنے اندر وہ نظیر بینا پیدا کر سکیں۔ وہ بلوغت احساس پیدا کر سکیں جس کی ضرورت ہر ملت کو ہوتی ہے۔ بالخصوص اس ملت کو ہوتی ہے جو زوال کی طرف گامزن ہو۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آج ملت پاکستانیہ زوال کی راہ پر گامزن ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ زوال کی نشاندہی سب کرتے ہیں۔ سب بہانگ دہل یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ ہم مسائل کا شکار ہیں۔ ہم تفرقوں کا شکار ہیں' ہم گروہوں میں بٹ چکے ہیں۔ لیکن کوئی یہ کہنے کی ہمت نہیں کرتا کہ بھائی ان تمام امراض کا علاج کون کرے گا؟ مجھے یقین ہے کہ آپ تمام حضرات کے روشن اذہان کو اس سے زیادہ اور کسی روشنی کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ سب بخوبی جانتے ہیں' اپنے مسائل کو بھی سمجھتے ہیں۔ ان مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لئے یہ چند معروضات میں نے پیش کی ہیں ان سے بھی استفادہ کریں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ اپنے دائرہ کار میں رہتے ہوئے نہ صرف اس پیغام کو آگے بڑھانے کی کوشش کریں بلکہ ملت کے مسائل کو سمجھتے ہوئے ان

کے حل کرنے کے لئے عملی اقدامات کریں- اس لئے کہ عمل- وہ جو بہت عام شعر ہے' بچہ بچہ جانتا ہے کہ-

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری' نہ ناری ہے

پاکستان میں بہت آسانی سے لوگ کہہ دیتے ہیں کہ فلاں جو ہے وہ جہنمی ہے- مجھے یاد آتا ہے میرے ایک بہت محترم دوست نے ایک دلچسپ بات کہی تھی کہ خدا اگر بندے کو یہ فیصلہ کرنے کا فریضہ سونپ دے کہ کون جہنم میں جائیگا اور کون [illegible] کم کوئی پاکستانی جنت میں نہیں جا سکے گا [illegible] ہر پاکستانی دوسرے پر یہ فتویٰ صادر [illegible] تو زندیق ہے- یہ تو جہنمی ہے ! اور [illegible] ایک دوسرے کو جہنمی قرار دینے کی دوڑ [illegible] اس راہ پر جا رہے ہیں جو دنیا میں ہی [illegible] پیش کر دیتی ہے- میں ان الفاظ کے ساتھ [illegible] حضرات سے رخصت چاہتا ہوں-

اپیل

مفکر قرآن علامہ غلام احمد پرویزؒ کا سلسلہ تفسیر القرآن بعنوان مطالب الفرقان (قرآن کریم کی تفسیر- خود قرآن سے) اس وقت سات جلدوں تک شائع ہو چکا ہے- جلد ہشتم کی تیاری شروع ہے-

بزم طلوع اسلام راولپنڈی نے درس قرآن کا تحریری مواد کافی حد تک مہیا کر دیا ہے- مزید مواد کسی صاحب کے پاس موجود ہو تو ان سے التماس ہے کہ وہ زیر دستخطی کو مطلع کر کے ممنون فرمائیں-

ڈاکٹر زاہدہ خانم درانی
سربراہ طلوع اسلام ٹرسٹ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نئے پڑھنے والوں کے لئے

طلوع اسلام کے متعلق آپ کو عام طور پر بتایا جائے گا کہ یہ کہتا ہے سنت رسولؐ اللہ کو مت مانو۔ سب حدیثوں کو دریا بُرد کر دو۔ اسلاف کی کوئی بات نہ مانو وہ قرآن کو نہیں سمجھتے تھے۔ اس کے بعد آپ سے کہا جائے گا کہ طلوع اسلام والے ملحد ہیں۔ بے دین ہیں۔ یہ ایک نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتے ہیں' بلکہ ایک نیا مذہب ایجاد کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے نہ ان کی کوئی بات سنو' نہ ان کا لٹریچر پڑھو۔

یہ الزامات بڑے سنگین ہیں اور اگر یہ سچے ہیں تو پھر آپ سے جو کچھ کہا جاتا ہے وہ بالکل بجا اور درست ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ آپ اس کے متعلق کچھ فیصلہ کریں' کیا یہ ضروری نہیں کہ آپ تحقیق کر لیں کہ کیا یہ الزامات واقعی سچے ہیں؟

(1) طلوع اسلام : نے کبھی یہ نہیں کہا کہ سنت رسولؐ اللہ کو نہ مانو اور سب احادیث کو دریا بُرد کر دو۔ وہ کہتا صرف یہ ہے کہ احادیث کی کتابوں میں صحیح حدیثیں بھی ہیں اور غلط بھی۔ جو حدیث قرآن کریم کے مطابق ہے وہ صحیح ہے۔ جو اس کے خلاف جاتی ہے وہ غلط ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس قسم کی غلط احادیث کو چھوڑ دو۔ اور صرف صحیح احادیث کو مانو۔

(2) طلوع اسلام یہ بھی نہیں کہتا کہ اسلاف کی کوئی بات نہ مانو۔ وہ صرف اتنا کہتا ہے کہ اسلاف کی کتابوں میں بھی جو کچھ ہے اسے قرآن کریم کی کسوٹی پر پرکھ لو۔ جو بات اس کے مطابق ہو' اسے صحیح مانو' جو اس کے خلاف ہو اسے چھوڑ دو۔ وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ ہمارے بزرگوں نے قرآن شریف کو نہیں سمجھا تھا۔ وہ صرف یہ کہتا ہے کہ قرآن شریف ہر ایک کو حکم دیتا ہے کہ وہ اسے غور و فکر سے سوچ سمجھ کر پڑھے۔ اس لئے ہمیں قرآن شریف پر خود غور کر کے اسے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

(3) طلوع اسلام کوئی نیا فرقہ نہیں بنانا چاہتا۔ فرقہ بنانا قرآن کریم کی رو سے شرک ہے۔

(4) طلوع اسلام کوئی نیا مذہب ایجاد کرنا نہیں چاہتا۔ اس کا ایمان ہے کہ قرآن کریم تمام نوع انسانی کے لئے واحد' مکمل' اور آخری ضابطہ حیات ہے۔ نبی اکرمؐ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں۔ اور اسلام ہی خدا کا سچا دین ہے۔

طلوع اسلام چاہتا یہ ہے کہ :

جس طرح کی حکومت' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضورؐ کے بعد خلفائے راشدینؓ نے قائم کی تھی' اسی قسم کی حکومت پاکستان میں قائم کی جائے تاکہ ہر شخص کی ضروریات زندگی باطمینان پوری ہوتی رہیں اور کوئی بھوکا ننگا نہ رہے۔ ہر شخص سے عدل و انصاف ہو اور قرآن شریف کے خلاف جس قدر قانون ہیں وہ سب منسوخ ہو جائیں اور قانون صرف خدا کا چلے۔ یہ بات ان لوگوں کو ناگوار گزرتی ہے جو خالص خدا کا قانون نہیں چاہتے۔ کیونکہ اس سے ان کی ذاتی اغراض پر زد پڑتی ہے۔ اس لئے وہ طلوع اسلام کی مخالفت کرتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رحمت اللہ طارق (ملتان)

صنف نازک پر مجازی خداؤں کی چیرہ دستیاں

سورۂ نساء میں فرمایا وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ذٰلِکَ اَدْنٰی اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝

اگر تمہیں یتیم بچیوں کے معاملہ میں اندیشہ ہو کہ انصاف نہ کر سکو گے تو (پھر) دیگر خواتین میں سے جو تمہیں پسند ہوں ان میں سے ایک تا چار بیویاں کر سکتے ہو۔ اس پر بھی تمہیں اگر خوف ہو کہ انصاف یہاں بھی نہ ہو سکے گا تو صرف ایک سے نکاح کرو یا پھر ان ہی پر اکتفا کرو جو پہلے سے تمہارے عقد میں ہیں اور یہ ایک کی بات اس لئے (بھی) ہے کہ تمہارا عیال یعنی بچے نہ پڑھنے پائیں۔ (نساء_ 3)

اس آیت کا پس منظر باہر سے ڈھونڈ کر نہیں لایا گیا۔ آیت کے پہلے فقرے "الیتامٰی" یا نساء (2) میں اسی لفظ نے خود ہی فراہم کر دیا ہے کہ اسلامی جنگوں کے لئے باقاعدہ فوجیں نہیں ہوا کرتی تھیں۔ ہر شخص "نفیر عام" پر میدان میں نکل آتا اور جان کی بازی لڑا دیتا تھا۔ اس حالت میں یتیم بچیوں اور بیوہ خواتین کا بکثرت میسر آنا عین ممکن تھا۔ ادھر ایمرجنسی کی اسی حالت کو دیکھتے ہوئے مسلم بے سہارا بچیوں اور خواتین کو اپنے ہی اسلامی معاشرے میں کھپانے کیلئے احساس دلایا کہ مسلمانوں میں سے جو لوگ ان کو بسانا چاہیں دو' تین اور چار تک بسا سکتے ہیں تاہم اگر اندیشہ ہو کہ یتیم بچیوں کی حق دائیگی نہ ہو سکے گی تو فرمایا۔ انہیں چھوڑ کر دیگر عورتوں جن میں ان کی مائیں بھی شامل ہیں ان سے شادی کر لو۔

یہاں چونکہ اضطراری کیفیت نمودار تھی لہٰذا تعداد سے زیادہ بحث نہیں کی گئی لیکن امام رازی (1210م) نے اضطرار کو اختیار میں بدل کر ایسی توجیہات اور ترجیحات کا سہارا لیا جو نہ صرف آیۂ زیر بحث کے منافی تھیں اس کی ہم زلف دیگر آیات کے مشن و مقصد سے متصادم بھی تھیں۔ یہاں "فَانْکِحُوْا" سے کسی نئے مسئلہ کا آغاز نہیں کیا گیا کہ۔ فا۔ تعقیب کے لئے ہوتی ہے اس سے پہلے جس بات کا تذکرہ ہو چکا ہوتا ہے اس کے بعد ہی برائے ربط اس کا آنا ضروری ہوتا ہے اور یہاں پہلے جس بات کا تذکرہ ہو چکا' وہ یتیم بچیوں کی حق ادائیگی کا تھا اور ظاہر ہے کہ کوئی بچی بلاوجہ یتیم نہیں بن جاتی اور کوئی خاتون بغیر سبب کے بیوہ نہیں ہو جاتی۔ اب کسی بھی وجہ سے اگر وہ آفت زدہ بن گئی ہیں تو قرآن۔ ان کے لئے خصوصی ہدایات دے کر اپنا فرض پورا کر لیتا ہے۔

بیویوں کی بھرمار کا اسلامی فارمولا:- لیکن امام رازی ایک سیدھی سی بات کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ان کا خیال ہے کہ "یہاں توجہ دلائی گئی ہے کہ

انسان اپنی پسند کی جتنی عورتوں سے چاہے نکاح کر سکتا ہے چار کی تعداد آخری حد نہیں ہے وہ کہتے ہیں کہ

"بے حد و بے حساب بیویاں کرنے کی تیسری دلیل یہ ہے کہ **مثنٰی و ثلاث و رباع** کی واو علے الاطلاق جمع کیلئے ہے یعنی دو دو' تین تین' چار چار سے شادی کر سکتے ہو' اب بادی النظر میں دو' تین اور چار جملہ نو کا عدد بنتا ہے **بل الحق انه یفید ثمانیة عشی**- لیکن "حق تو یہ ہے کہ اس سے اٹھارہ کی تعداد بر آتی ہے کیونکہ "مثنٰی" سے دو ہی کا ہندسہ مراد لینا ضروری نہیں ہے اس کا اصل ہدف دو دو ہیں "(یعنی چار) اسی طرح ثلاث کا اصل ہدف تین تین (یعنی چھ) اور رباع- کا چار چار (یعنی آٹھ) ہیں (جملہ اٹھارہ) (تفسیر رازی طبع محمد عبدالرحمان قاہرہ جلد 9/174-175)

رازی کے استدلال پر اعتراض ہو سکتا تھا کہ اس آیت کے نزول کے وقت غیلان (640م) کے پاس نو بیویاں تھیں اس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر پانچ کو طلاق دیدی اور چار کو اپنے پاس رہنے دیا اسی طرح نوفل بن معاویہ (649م) جب اسلام لائے تو اس کے نکاح میں پانچ بیویاں تھیں جن میں سے چار کو اس نے روک کر ایک کو چھٹی دیدی- اب اگر آٹھ یا اٹھارہ تک اجازت ہوتی تو اس آیت کے نازل ہونے پر آپؐ غیلان اور نوفل کو چار سے زائد بیویوں کو چھوڑ دینے کا حکم کیوں دیتے؟ اس کے جواب میں امام رازی فرماتے ہیں-

قرآن جب کسی تعداد پر رک نہیں جاتا اور بے حد و بے قید بیویوں کی اجازت دیتا ہے تو ان احادیث کو درخور اعتنا سمجھنے کے معنی ہوں گے "**خبر واحد**" کے ذریعہ قرآن متواتر کو منسوخ کرنے کے-- جبکہ حدیث قران کو منسوخ کر ہی نہیں سکتی- (تفسیر رازی 9/175/6 تا 10)

کثرت ازدواج عائلی تنظیم کے منافی ہے :-

امام رازی نے ایک صحیح اصول کو غلط مقصد کیلئے استعمال کر کے دراصل اپنی "جدلی" نفسیات کا اظہار فرمایا ہے ان کا آیہ زیر بحث کو "جدلی" پرواز کی جولانگاہ بنا کر اس کی رو سے پہلے اٹھارہ پھر بے حد و حساب بیویوں اور لاتعداد لونڈیوں کو مباشرت کیلئے تیار رکھنا قرآن کے عائلی فلسفہ کو پامال کر دینے کے مترادف بھی ہے اور نساء (128) کو متضاد کے مقام پر رکھ کر بلاوجہ قرآن شکنی کا اہتمام کرنے کے برابر بھی- ارشاد ہے **وَلَنْ تَسْتَطِيعُوٓا اَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ**

تم اگر پورے حرص اور شدید خواہش کے ساتھ کوشش کرو کہ مختلف بیویوں میں انصاف قائم کر لو گے تو ہرگز نہ کر سکو گے- ایسی استطاعت تمہیں میسر آہی نہیں سکتی- (نساء' 128)

اس طرح یہ آیت امام رازی کی توجیہات و ترجیحات کا پتہ ہی کاٹ کے رکھ دیتی ہے- اٹھارہ اور بے حد و حساب کیا' سرے سے کثرت ازدواج کے نظریئے کو بالکل ہی مفلوج اور اس کی عملی تعبیر کو مشکل بنا دیتی ہے- قرآن حکیم نے مسلم افرادی طاقت کے مرکھپ جانے کی صورت میں جو ہنگامی ہدایات دی تھیں ان میں "**اَلَّا تُقْسِطُوا**" کو بنیادی "علت" کے طور پر درمیان میں لا کر واضح فرما دیا تھا کہ یتیم بچیوں اور بیوگان کو کثرت سے بسانا انسانی

بساط سے باہر ہے۔ تاہم تمہیں اگر اندیشہ ہو کہ یتیم بچیوں کی حق ادائیگی میں انصاف نہ کر سکو گے تو ان کی ماؤں سے شادی کر لو کہ اس طرح ان بچیوں سے تمہارا دوہرا تعلق پیدا ہو گا اخلاقی بھی اور سماجی بھی۔
اس طرح قرآن محکم نے تعدد ازدواج کی خرابی کی بنیادی علت بیان کر کے خود ہی اشارہ دیدیا کہ یہ " اجازت" حالات ما بعد از جنگ سے مربوط تھی کہ جنگوں میں مردانہ افرادی طاقت کا کام آنا فطری بات تھی اور اس کے نتیجہ میں صنفِ نازک کا بکثرت میسر آنا۔ لیکن بنابریں آیہ زیر بحث میں۔ **مثنیٰ و ثلاث و رباع**۔ کو "حق رسی" اور انصاف سے مربوط کر کے پھر خود ہی اسے ناممکنات میں ٹھہرا کر۔ **فواحدۃ** کے آہنی حصار میں لے آئے۔ شہاب الدین آلوسی (1854) لکھتے ہیں۔ یہاں **ذالک ادنیٰ ان لا تعولوا** میں **ذالک**۔ کا اشارہ۔ **فواحدۃ** کی طرف ہے یعنی ایک پر اکتفا کرنا اسلئے (بھی) ہے کہ تمہارا عیال بڑھنے نہ پائے۔ (تفسیر روح المعانی طبع فوٹو بیرو جلد 27/196/4)

بات صاف ہو گئی کہ بعد آخر۔ ایک بیوی پر اکتفا کرنا ہی مقصودِ فطرت ہے۔ یہی امر زیادہ موزوں' نفسیاتِ محبت و عدل کے مطابق اور قانون امتزاج و توازن کے ہم آہنگ بھی۔ کہ مختلف بیویوں کی رقابت' اولاد کے مابین دشمنی اور ایک کی طرف جھکاؤ کی وجہ سے حقوق میں تلفی کا در آنا فطری امر ہے اور فطرت نہیں چاہتی کہ کسی کے گھر کا ماحول چپقلش' فساد اور باہمی کشمکش کا ماحول بن کر رہ جائے' انتقامی جذبات پروان چڑھیں اور جائیداد پر قبضہ کے لئے ناآسودہ خواہشیں پرورش پائیں۔ کیونکہ راجہ اندر بننے سے عائلی کلچر کی تباہی ایک بدیہی امر ہے۔

کثرت اولاد بھی مطلوب خدا نہیں

سورہ نساء نے ایک ہی آیت (3) میں دو حکم سنائے ہیں اور دونوں ہی عائلی قوانین سے گہرا تعلق رکھتے ہیں پہلے **فواحدۃ** (ایک ہی بیوی) کی وضاحت کر کے انصاف کو خطرے میں ڈالدیا دوسری یہ وضاحت کہ کثرت اولاد بھی فطرت کو منظور نہیں ہے لہٰذا فرمایا اگر بیویاں زیادہ ہونگی تو کثرت اولاد کی آفت سے نجات ناممکن ہو کر رہجائے گی **ذالک ادنیٰ ان لا تعولوا**

اس طرح خلاق ازل نے ہماری کمزوریوں کا پہلے ہی سے احاطہ کر کے احساس دلایا کہ کثرت ازدواج سے کثرت اولاد کا ہونا ناگزیر ہے جبکہ فاطر ازل چاہتے ہیں کہ تمہارا عیال (بچے) نہ بڑھنے پائیں۔ عربی میں "عول" کے معنی کثرت کے بیان ہوئے ہیں۔ ادبیات عرب کے ایک راہوار ابوعمرو والد وری کہتے ہیں کہ۔ قبائل حمیر کی زبان میں "عول" مال و اولاد کی کثرت پر بولا جاتا تھا۔ شاعر کہتا ہے

ان الموت یاخذ کل حیی'
بلا شک وان امشیٰ و عالا

موت بلاشبہ ہر انسان کو دبوچ لیتی ہے خواہ اس کے پاس مویشیوں اور اولاد کی کثرت ہی کیوں نہ ہو۔ (تفسیر نیل المرام طبع مصر 1929م ص 102)

عول۔ ہی کے ضمن میں نواب صدیق حسن (مرحوم) (1889م) امام شافعی کی زبانی فرماتے ہیں۔ **ان لا تعولوا اے لا یکثر عیالکم لا تعولوا**۔ کے معنے ہیں تمہاری اولاد بڑھنے نہ پائے۔ (نیل المرام۔ ص 102)

امام شافعی کے اس مفہوم پر ثعلبی (1035م) اور ابن العربی (1218م) کو لغوی زاویے سے

اعتراض تھا جس کے جواب میں صدیق حسن فرماتے ہیں امام شافعی پر خفگی کس لئے؟ جبکہ آپ سے پہلے مسلمانوں کے مسلمہ امام- زید بن سلیم (753م) اور جابر بن زید (745م) بھی "عول" کے معنے کثرت اولاد ہی کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ شافعی ہوں یا یہ دونوں امام سبھی اہل زبان تھے اور قرآن کے ایسے معنی تجویز نہ کر سکتے تھے جس کے لئے "عربیت" میں کوئی سند نہ ملتی ہو' خاص کر ادبیات عرب کے سب سے بڑے شناور کسائی (805م) ابو عمر والدوری اور ابن الا عرابی (843م) سے قرطبی (1273م) نے وہی معنے نقل کئے ہیں جو امام شافعی نے بیان فرمائے ہیں- (نیل المرام- ص 102 سطر 15 تا آخر)

رازی نے معتزلی امام زمخشری (1144ء) سے نقل کیا ہے- **من کثر عیالہ لزمہ ان یعولھم** (بحذف طویل عبارت)- کثرت عیال سے بچنے کیلئے ایک شادی کرنے کی فلاسفی یہ ہے کہ جس کے بچے زیادہ ہوں گے ان کی پرورش اس کی ذمہ داری ہو گی- لیکن یہ اس وقت ممکن ہے جب تک وہ کسب حلال' رزق طیب (پاکیزہ روزی) اور پارسائی کی حدود کو پامال نہ کر ڈالے- کیونکہ حلال کمائی کی صورت میں ڈھیر بچوں کی پرورش سے عہدہ برا ہونا مشکل ہے-

اس پر اٹھارہ بلکہ بے حد و حساب بیویوں والے امام رازی لکھتے ہیں-

یہ تھیں وہ وجوہات جنہیں ملحوظ رکھ کر امام المسلمین شافعی (820م) نے ایک ہی بیوی پر اکتفا کرنے کو لازم ٹھہرایا ہے اور حق تو یہ ہے کہ امام موصوف کی یہ توجیہ خوب اور خوب تر ہے (فی غایۃ الحسن)- (تفسیر رازی طبع 938 مصر- جلد 178/9)

شہاب الدین محمود- شافعی کی حمایت میں :-

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ عال یعول کے باب سے کثرت اولاد کا مفہوم واضح نہیں ہوتا- اس کے لئے (فعال کا باب ہونا چاہئے؟)

یہ بات اگرچہ طے شدہ نہیں ہے بلکہ دانشوران عرب ایسی پھسپھسی توجیہ کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے تاہم بات کو مختصر کرنے کیلئے شہاب الدین آلوسی لکھتے ہیں-

امام شافعی نے "تعولوا" (نساء 3) کے فعل کو عال الرجل عیالہ سے کنایہ ٹھہرایا ہے جس کے معنے کثرت عیال ہی کے صحیح ہوتے ہیں- فرمایئے اب کیا اعتراض ہے؟ (تفسیر روح المعانی طبع منیریہ مصر- جلد 4/197/6 تا 7)

بیضاوی اور رازی کہتے ہیں :-

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ "عول" کے معنی ظلم اور جور کے بھی ہیں یعنی ایک بیوی اس لئے ہے کہ تم ناانصافی کی راہ اختیار نہ کرو سکو- وغیرہ-

یہ درست ہے کہ الفاظ متعدد معانی میں تقسیم ہوتے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ معنے یابی میں قرائن کو جو توانائی حاصل ہے اہل زبان نے اسے ہمیشہ ملحوظ رکھا ہے- وہ کہتے ہیں کہ جیسا قرینہ ویسے معنی- اس طرح کسی لفظ کو محدود مفہوم میں کھینچ کرنا صرف قرینہ کے ذریعہ ہی ممکن ہے- یہاں عول کو کثرت اولاد کے مفہوم میں استعمال کرنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ- نکاح کو ایک ہی بیوی میں محدود کر کے پھر فرما دیا کہ اولاد بڑھنے نہ پائے یعنی تحدید نکاح کی "علت" تحدید نسل فرما دی ہے- رہی ظلم و جور کی بات تو اس کے جواب میں قاضی بیضاوی تعزلی

(1286م) اور امام رازی (1210م) لکھتے ہیں کہ عول کے معنے اگر ظلم و ستم ہی کے کئے جائیں تو یہ معنی- **ان لا تقسطوا** (نساء' 3) میں پہلے ہی سے واضح ہیں اعادے اور تکرار کی ضرورت نہیں ہے **اما اذا حملنا علی ماذ کرہ الشافعی لم یلزم التکرار فکان اولٰی** لیکن اگر امام شافعی کے مفہوم کو ترجیح دیجائے تو موزوں بھی ہے اور قرآن محکم میں تکرار و اعادے کی قباحت بھی لازم نہیں آئے گی- (بحوالہ رازی 9/179/ 9 تا 12)

مفکر قرآن :- حضرت علامہ پرویز مرحوم فرماتے ہیں-

"العیال" وہ افراد جن کے اخراجات کا انسان ذمہ دار ہو- (لغات القرآن بحوالہ تاج العروس- طبع طلوع اسلام جلد 1211/1)

رسولؐ اللہ کی زبانی :- آیہ زیر بحث کی تفسیر میں نہ کوئی روایت ہے نہ حدیث- تاہم کسی اور موقعہ پر بقول راویان حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ- **ابداء بنفسک ثم من تعول** "پہلے اپنے سے آغاز کرو پھر اپنے عیال سے (مفردات راغب طبع دارا لفکر بیروت ص 366)

ان حوالہ جات سے واضح ہوتا ہے کہ تعدد ازدواج کی ایمرجنسی میں اجازت تو ہے لیکن اس اجازت کو مطلق جواز کی وجہ نہیں بنایا جا سکتا- اسی طرح کثرت اولاد بھی فاطر ازل کو مطلوب نہیں ہو سکتی- ورنہ تحدید ازدواج کی بات نہ ہوتی-

کثرت اولاد کی بابت واضح ہو کہ یہ ڈھیروں بیویوں کے توسط سے ہو یا ایک ہی زرخیز (بچہ آور) بیوی کے بطن سے قرآن کے عمومی لہجے اور حکم امتناعی کی رو سے ممنوع ہے-

عیاشی مفت اور نفع مستزاد :- فقہاء کا ارشاد ہے کہ---- **ان لا تعولوا**- کا حکم امتناعی لونڈیوں پر نافذ نہیں ہو سکتا وہ اس ممانعت سے مستثنٰی ہیں- کیونکہ وہ آزاد نہ ہونے کی وجہ سے خطاب الٰہی کی اہل نہیں ہیں لہٰذا ان پر کثرت ازدواج کی پابندی بھی عائد نہیں ہو سکتی- بنابریں کسی کے پاس زیادہ بیویاں اور زیادہ بچے ہوں گے تو آقا کے لئے ضروری ہے کہ انہیں کما لانے پر مجبور کرے تاکہ اولاد کا خرچہ بھی برداشت ہو اور آقا بھی فراوانی سے کھائے پیئے اور یہ وہ فرق ہے جو آزاد اور لونڈیوں کے مابین ہے یعنی لونڈی چونکہ کما لائے گی لہٰذا میاں پر بوجھ نہیں بنے گی **بناءً علی ہذا** ان کو بے حد و بے حساب اپنے تصرف میں لانے پر پابندی بھی نہیں ہے- جہاں آزاد عورتوں کی چار تک تحدید ہے وہاں لونڈیوں کیلئے کوئی تحدید نہیں ہے- ان کا حق مہر بھی نہیں ہے' اور باری مقرر کرنے کی زحمت بھی نہ کرنا ہو گی- وہ زیادہ اولاد پیدا کرنے والیاں ہونگی تو **لا تعولوا** کے اطلاق سے آزاد ہوں گی- (تفسیر رازی جلد 2/179/9 تا 7)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باغبان

باغبان حضرات کے نام (کھلا خط) 2

السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ'

کیریکٹر کا انعام

مورخہ 31 مارچ 1996ء پی ٹی ماسٹر محترم محمد اسحاق خان صاحب کی طرف سے مجھے دعوت ملی کہ آپ یکم اپریل 1996ء گورنمنٹ ہائی سکول موہڑہ سیداں مری کی تقریب میں شرکت کریں- میں مقررہ وقت پر پہنچ گیا- ہیڈ ماسٹر مدرسہ محترم سید ضمیر حسین صاحب ایم اے- بی ایڈ نے مجھے کرسی صدارت کا اعزاز بخشا- تلاوت قرآن کریم اور نعت شریف کے بعد ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپنے استقبالیہ کلمات میں تعلیمی سرگرمیوں اور نتائج پر روشنی ڈالی- پھر جماعت وار اول تا نہم نتائج سنائے- تالیوں کی گونج میں جماعت وار اول- دوئم- سوئم پوزیشن حاصل کرنے والے طلباء کو دس دس روپے نقد انعام دیا گیا- میری طرف سے کیریکٹر کا خصوصی انعام -/50 روپے سٹاف کی طرف سے ایک منتخب کردہ طالب علم امتیاز حسین جماعت نہم کو دیا جانے والا تھا کہ سکول کے ایک استاد محترم سید صغیر حسین شاہ صاحب نے اس پر خوشگوار اضافہ کرتے ہوئے -/50 روپے مزید پیش کر دیئے- یوں کیریکٹر کا خصوصی انعام پانے والے طالب علم نے تالیوں کی گونج میں -/100 روپیہ کا انعام وصول کیا-

اپنے صدارتی کلمات میں' میں نے سائنسی انداز فکر اپنانے کے لئے سائنسی تعلیم کو ضروری قرار دیا اور وعدہ کیا کہ ہم سکول کے لئے ایک S.S.T. سائنس ٹیچر مل جل کر حاصل کرنے کی پوری کوشش کریں گے اور آئندہ سال حاضر باشی- صفائی- سچائی- دیانتداری اور وفا داری کے نقطہ نظر سے سٹاف کے منتخب کردہ طالب علم کو کیریکٹر کا خصوصی انعام -/100 روپیہ دیا جائیگا-

مغرب نے ہمیں یکم اپریل- اپریل فول کے طور پر منانے کا شر انگیز تصور دیا- میں آج یکم اپریل کو اپنی 63 ویں سالگرہ ایک تعلیمی ادارے میں بغیر اعلان کے منا رہا ہوں- آیئے ہم سب مل کر اپریل فول کے باطل تصور کو کیریکٹر کے نور سے ختم کر دیں اور پاکستان سے اس کو دیس نکالا دیدیں- گر قبول افتد زہے عزو شرف-

میں باغبان حضرات اور قارئین سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ قدم اول کے طور پر ہائی سکولوں (سرکاری و غیر سرکاری) میں کیریکٹر کا انعام دینے کی تحریک کو آگے بڑھانے میں تعاون کریں- اس سے ایسے "جواں امروز" ملتے جائیں گے جو کل کا بہترین سرمایہ ثابت ہونگے-

والسلام

ملک حنیف وجدانی
صدر باغبان ایسوسی ایشن
معرفت موہڑہ سیداں' مری
پوسٹ بکس نمبر 47224

ALLAMA G.A. PARWEZ AND QUAID-I-AZAM

National Archives of Pakistan have undertaken" Quaid-i-Azam paper Project" and have published a number or volumes of ``JINNAH PAPERS''. We take the opportunity of re-producing from this book, letters written to and by Allama Ghulam Ahmed Parwez. (This issue includes a letter from Quaid & Reply from Parwez)

(1) Letter from Quaid-i-Azam(r):

10 AURANGZEB ROAD
NEW DELHI
14th June, 1947.

Dear Mr. Parvez,

I thank you for your letter of 13th June. Will you please send me the names of those who, you think, will be the real. Servants of our future Secretariat?

Yours sincerely,
(Signatures in English)
M.A.Jinnah

G.A. Parvez, Esq.,
37, Turkman Road,
NEW DELHI.

Please turn page for Reply from Allama G.A.Parwez.

اللہ آپ کی عمر دراز فرمائے

ہماری دلی تمنا ہے کہ ہمارا اور آپ کا زندگی بھر کا ساتھ رہے اور ماہنامہ طلوع اسلام زندگی کے آخری سانس تک آپ کے پاس پہنچتا رہے۔ جی ہاں! ایسا یقیناً ممکن ہے۔ صرف 1000 روپے یکمشت ادا کر کے آپ لائف ممبر بن سکتے ہیں۔

(یہ سہولت صرف پاکستان میں بسنے والے قارئین کے لئے ہے)

2) Reply from Allama G.A. Parwez(r):

G.A.Parwez to M.A. Jinnah
F.886/235-6

37 TURKMAN ROAD, NEW DELHI,
18 JUNE 1847

Respected Quaid-i-Azam,

I am much obliged to you for your letter of the 14th instant,[1] in which I have been asked to send you the names of those who will be the true servants of our future Pakistan Secretariat. The list is being prepared and will be submitted to you in a couple of days' time. In the meantime, there are one or two other important points to which I beg liberty to invite your attention.

It is observed that the work is being done by us these days only haphazardly. here is enthusiasm no doubt, but no co-ordination or systematic working according to some plan. The work regarding the formation of our future Secretariat is stupendous and should not be left either to the present Government or in the hands of those working haphazardly. The time at our disposal is short. I think we should set up a ''Secretariat Organisation Committee'' of our own. The Committee should select members from the various Departments to co-opt. These members should submit detailed reports as to how corresponding Departments should be formed in the Pakistan Secretariat. These reports should then be considered by the top Committee. The reports should deal with (i) the subjects at present dealt with in the various Sections of the various Departments, (ii) the Sections considered necessary in the future Secretariat, (iii) the staff required for these Sections, (iv) the selection of the staff, (v) other requirements of the office and how to procure them, (vi) accommodation required, and so forth. This Committee, with the co-opted members, should be responsible for the formation of the Secretariat of Pakistan within the time at our disposal. Kindly excuse me if I lay stress on the point that unless members of the staff in the various Departments are co-opted, it will hardly be possible to get the machinery running. These members can be selected from the lists which I have promised to submit shortly.

The second point is that the Hindus in the Secretariat have started a sinister propaganda to the effect that the staff in the Pakistan Secretariat will not be given even one-half of their present emoluments; their scales of pay will be reduced; other amenities of service curtailed, and so forth. There are, no doubt, people who are prepared, nay anxious, to go over to the Pakistan Secretariat regardless of any consideration, but we must give allowance to human nature due to which some people have begun hesitating for [*sic* for over] announcing a decision. I don't propose to say that we should necessarily give our men the existing emoluments or scales, but I think

it is necessary that we should decide our policy and make it public as soon as possible. This would put a stop to the propaganda referred to above. The formation of the Committee mentioned above and its systematic working would also help much in the matter.

I think if we form a Committee of the kind mentioned above, with co-opted members from the various Departments, it would be necessary to ask the Government of India to spare the services of these members for employment exclusively on the work in question. At present, they have to attend to their normal office duties and at the same time do whatever possible in connection with the future Secretariat. It will be possible to complete our gigantic work only if the workers are employed exclusively on this work.

The above suggestions are only for your consideration and have been put forward for whatever they are worth.

Yours obediently,

G.A. Parwez

[1] Not available in *QAP*.

قابل تقلید

پرچہ خرید کر پڑھنے اور اسے دوسروں تک پہنچانے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ قرآنی فکر کی نشرواشاعت ہم سب کا فرض ہے۔ اس کار خیر میں آپ بھی حصہ لے سکتے ہیں۔ 120 روپے کی بات ہے۔ ایک پرچہ اپنے کسی ایسے شناسا کے نام جاری کروا دیجئے جس تک اس روشنی کا پہنچنا آپ کے خیال میں مفید ہو سکتا ہے۔

(ادارہ)